تحقیق مسئلہ ایصالِ ثواب

نعمانی (محمد منظور)

کیا ہم اپنے اعمال سے اموات کو کوئی نفع اور ثواب پہنچا سکتے ہیں؟

ملقب بہ

تحقیقِ مسئلہ ایصالِ ثواب

از

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

مدیر "الفرقان" بریلی

...ن کی اجماعی تحقیقات سے بھی
...ن" کا فیشن سا ہوگیا ہے۔
...ہے) سب سے بڑا اور خطرناک
...ے متعلق ناواقفوں کے ایک وسیع
...ں پر بھی از سر نو بحث و استدلال
...ے کہ :-

...ن کو کوئی نفع اور کسی نیک عمل
...کا ثواب بھیجنے کا، خصوصاً اس کے لیے صدقہ وغیرہ کرنے سے کچھ ثواب اُس کو پہونچ سکتا ہے یا نہیں؟

یہ مسئلہ اگرچہ جمہور امت کے نزدیک مسلم بلکہ معمول بہا رہا ہے، اور تفصیلات وجزئیات کے بعض معمولی اختلافات کے باوجود اس اصل پر ائمۂ امت کا خلفاً عن سلف اتفاق اور اجماع رہا ہے کہ "زندوں کے دعاو استغفار سے اور موتیٰ کے لیئے صدقات وغیرہ کرنے سے مردوں کو نفع ہوتا اور ثواب پہنچتا ہے۔" حاملان دین کے تمام وہ طبقے جن کی وساطت سے علم دین کی امانت ہم تک پہنچی ہے یعنی فقہا ومجتہدین اور محدثین ومفسرین سب ہی اس کے قائل ہیں اور اپنے نزدیک قابل اتباع دلائل وبراہین کی بنیاد پر قائل ہیں۔ (جیسا کہ مختلف مکاتب خیال کی قدیم وجدید فقہی کتابوں اور وافر آثار وروایات سے معلوم ہوتا ہے) لیکن ہمارے زمانہ کے بعض حضرات کو اس سے انکار ہے۔ اور اس انکار میں زیادہ حصہ اُن لوگوں کا ہے جن کو حدیث کے حجت دینی ہونے پر یقین و اعتماد نہیں ہے۔

اِس خیال کے جن مختلف حضرات کی باتیں سننے کا راقم کو اتفاق ہوا ہے۔ اُن سب ہی کی نمایاں طور سے استدلال میں قرآن مجید کی وہ آیتیں سننے میں آئیں جن میں اس اصول کو مختلف عنوانات سے واضح کیا گیا ہے کہ "انسان کو اپنے ہی کئے کا بدلہ ملیگا۔ اور جزا و سزا کا دارومدار اس کے

اپنے ہی کردار پر ہوگا۔ مثلاً:۔

(۱) لیس للانسان الا ما سعیٰ" (۲) کل نفس بما کسبت رہینۃ" (۳) کل امرئ بما کسب رہین" (۴)
ہل تجزون الا ما کنتم تعملون" (۵) لہا ما کسبت وعلیہا ما اکتسبت" (۶) من عمل صالحاً
فلنفسہ ومن اساء فعلیہا"

اس قسم کی آیات سے مغالطہ کھانے یا مغالطہ دینے کے علاوہ ان حضرات کے کچھ اور اپنے دماغوں کے زائیدہ خیالات بھی ہیں، جن کو کبھی کبھی "درایت قرآنیہ" کے پرشکوہ اور مرعوب کن عنوان سے یہ حضرات پیش کرتے ہیں (اس خیال کا ترجمان ایک مضمون "الفرقان" (ص ۵۹ جلد ۱۰) میں بھی شائع ہو چکا ہے۔)

یہ مقالہ جو ان صفحات میں ہدیہ ناظرین کیا جا رہا ہے اسی مسئلہ کی توضیح و تقریر سے متعلق ہے اور غرض اس سے صرف اس چیز کو واضح کرکے پیش کر دینا ہے جس کو یہ عاجز دلائل شرعیہ کی روشنی میں حق سمجھتا ہے۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

یہاں یہ چیز بھی صفائی کے ساتھ عرض کر دینی ضروری ہے کہ اس باب میں میں صرف اتنی ہی چیز کا قائل اور اسی قدر کا حامی ہوں جتنا کہ اصولی طور پر دلائل شرعیہ سے ثابت ہے، باقی صدیوں سے اس بارہ میں جو غلو ہو رہا ہے اور عملاً اول درجہ کی اہمیت کا جو مقام اس مسئلہ کو دیدیا گیا ہے (کہ صرف عوام ہی میں نہیں بلکہ بہت سے خواص کا عوام میں بھی فرائض و واجبات سے بھی زیادہ اس کا اہتمام کیا جاتا ہے) تو یقیناً وہ میرے نزدیک بھی قابل انکار ہے۔ اس کے علاوہ تیجے سے لیکر ہر سال کی برسی تک رسموں کا جو لامتناہی سلسلہ ایصال ثواب کے ماتحت ایجاد کیا گیا ہے اور جس طرح ان رسموں کی ادائگی ہوتی ہے یہ سب تو بلاشبہ از قبیلۂ بدعات و خرافات ہے اس کا دین و مذہب سے کیا تعلق بلکہ دین کے سر ان لغویات کو منڈھنا اپنی جہالت اور دین کے ساتھ سخت بدخواہی ہے۔ بہرحال اس مقالہ کی تحریر سے میری غرض ائمہ امت کے متفقہ صرف اس اصولی مسئلہ ہی کی تائید و حمایت ہے کہ "زندوں کی کوششوں سے مردوں کو نفع پہنچ سکتا ہے اور "ایصال ثواب" کا نظریہ حق و ثابت ہے۔

مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کے لحاظ سے اس مقالہ کو سات بحثوں پر تقسیم کر دیا گیا ہے۔ حضرات منکرین کے خیالات و استدلالات پر بحث آخری بحث میں کی گئی ہے۔ وما ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ
شعبان ۱۳۶۳ھ

مبحث اوّل

دُعا و استغفار برائے اموات!

زندوں کے جن مساعی اور اعمال سے مردوں کو نفع پہنچا و ثائق دینیہ سے ثابت ہو اون میں سے ایک "دُعا و استغفار" ہی۔ اس کا غیر مشکوک ثبوت بے شمار احادیث کے علاوہ خود قران مجید سے بھی ملتا ہے۔ ایک جگہ اولاد کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اپنے والدین کے حق میں اس طرح دعا کرے :-

وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيراً

اے پروردگار! میرے ماں باپ پر رحمت فرما جیسا کہ اُنھوں نے مجھے بچپنے میں پالا پوسا۔

اور سورہ نوح میں حضرت نوح کی یہ دعا ہم کو سنائی گئی ہے۔

رَبِّ اغفر لی ولوالدیّ ولمن دخل بیتی مومناً وللمومنین والمومنات۔

میرے مالک! مجھے اور میرے ماں باپ کو اور جو بھی ایمان کے ساتھ میرے گھر میں ہیں اُن کو اور ساری ہی مومن مردوں اور عورتوں کو بخش دے!

اور حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی بھی یہ دُعا قرآن مجید ہی میں نقل فرمائی گئی ہے۔

ربنا اغفر لی ولوالدیّ وللمومنین یوم یقوم الحساب ۝

خداوندا! مجھے اور میرے ماں باپ کو اور سارے مومنوں کو بخش دینا جس دن کہ حساب قائم ہو۔

ظاہر ہے کہ ان آیتوں کے لفظ "مومنین" و "مومنات" میں زندے مردے اگلے پچھلے سب ہی اہلِ ایمان داخل ہیں اور سورہ محمدؐ میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصی خطاب کرکے ارشاد ہوا ہے :-

واستغفر لذنبك وللمومنين والمومنات

اور اللہ سے بخشش چاہو اپنی تقصیر کی اور ایمان والوں کے لیے اور ایمان والیوں کے لیے۔

اور سورہ حشر میں "سابقین اولین من المہاجرین والانصار" کے بعد میں آنے والے اُن مسلمانوں

کی بڑی قدر افزائی کے ساتھ مدح کی گئی ہے جو مومنین سابقین کے لئے اللہ سے مغفرت کی دعائیں کرتے ہیں ارشاد ہے:۔

والذین جاءو من بعدھم یقولون ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان (حشر ع ۱)

اور وہ مسلمان جو آویں اُن کے بعد کہتے ہوں کہ اے ہمارے رب بخشدے ہم کو اور ہمارے اُن بھائیوں کو جو ہم سے آگے گئے ایمان کے ساتھ۔

اور سورۂ مومن میں عرش الٰہی کے حامل فرشتوں اور اسی مقام قرب کے دوسرے ملائکہ کے متعلق اطلاع دی گئی ہے کہ وہ اللہ کی تسبیح وتحمید کے ساتھ تمام مومنین توابین اور اُن کے آباء صالحین اور ازواج وذریات تک کے لئے اللہ سے مغفرت ورحمت کی دعائیں اور جہنم سے بچانے اور جنت میں داخل کرنے کی التجائیں کرتے رہتے ہیں۔ ارشاد ہے۔

الذین یحملون العرش ومن حولہ یسبحون بحمد ربھم ویؤمنون بہ ویستغفرون للذین آمنوا ربنا وسعت کل شیء رحمۃ وعلما فاغفر للذین تابوا واتبعوا سبیلک وقھم عذاب الجحیم ربنا وادخلھم جنات عدن التی وعدتھم ومن صلح من آبائھم وازواجھم وذریاتھم انک انت العزیز الحکیم (مومن ع)

جو فرشتے کہ عرش کے حامل ہیں اور جو ان کے گرد رہتے ہیں وہ اپنے رب کی تسبیح وحمد کرتے ہیں۔ اور اُس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان والوں کے لئے استغفار کرتے رہتے ہیں کہ اے رب ہمارے تیرا علم اور تیری رحمت ہر چیز کو محیط ہے پس تیرے جن بندوں نے تیری طرف رخ کرلیا ہے اور تیری راہ کو اختیار کیا ہے اُن کو تو بخشدے دوزخ کے عذاب سے اُن کو بچا اور جن جنات عالیہ کا تونے اُن سے وعدہ کیا ہے اُن میں اُن کو داخل فرما اور اُن کے آباؤ اجداد اور ازواج وذریات میں سے جو صالح ہیں اُن کے ساتھ بھی یہی معاملہ فرما۔ تو عزیز ہے۔ حکیم ہے۔

ان آیات سے تمام اہل ایمان کے لئے (خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ) دعاء واستغفار کا ثبوت کسی تقریر وتشریح کا محتاج نہیں، بلکہ پہلی آیت سے تو دعاء واستغفار کا صرف ثبوت ہی نہیں ہوتا ہے بلکہ خاصکر والدین کے حق میں اس کا منجانب اللہ مامور ہونا بھی معلوم ہو رہا ہے، دوسری اور تیسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے

کہ تمام مومنین کے لئے استغفار سیدنا نوح و ابراہیم علیہم السلام جیسے پیغمبروں کی سنت ہے۔

چوتھی آیت میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام اہل ایمان مردوں اور عورتوں کے لئے اللہ سے دعائے مغفرت کرنے کا حکم ہے۔ پانچویں آیت سے ظاہر ہے کہ اپنے سے آگے جانے والے اہل ایمان کے لئے دعائے مغفرت اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے، اور ایسا کرنے والوں کو اللہ کے یہاں خاص امتیاز حاصل ہے۔ اور چھٹی آیت کا مفاد یہ ہے کہ مومنین صالحین کے لئے مغفرت و رحمت کی دعا حاملانِ عرش کا بھی مشغلہ اور تسبیح و تحمید کی طرح گویا وظیفہ ہے۔

اور چونکہ یہ چیز ان آیات قرآنیہ سے صراحۃً ثابت ہے اس لئے مسئلہ "وصول ثواب" سے انکار کرنے والے وہ حضرات بھی جو اس مقالہ کے خصوصی مخاطب ہو سکتے ہیں "دعا و استغفار للاموات" کے عموماً قائل ہی ملے۔ البتہ صرف ایک صاحب ایسے ملے جو ان آیات کی بنا پر "دعا و استغفار" کے تو قائل ہیں، لیکن اسی کے ساتھ اُن کا خیال ہے کہ اس کا فائدہ صرف دعا یا استغفار کرنے والوں ہی کو ہوگا۔ گویا اُن کے نزدیک دعا و استغفار، نماز، یا تلاوت قرآن، یا ذکر اللہ کی طرح ایک مستقل عبادت ہے جس کا ثواب اُس کے کرنے والے کو ہی ہوگا۔ اور جس کے لئے دعا یا مغفرت و رحمت کی التجا کی جائے اُس کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچیگا۔ کیونکہ یہ اُن کے نزدیک "لیس للانسان الا ما سعیٰ" جیسی آیات کے خلاف ہے۔

اللہ اکبر! ایک غلطی پر اصرار اور جمود آدمی سے کیسی بڑی سے بڑی غلطیاں کرا دیتا ہے؟ ان حضرات نے "لیس للانسان الا ما سعیٰ" کے اپنی ذاتی رائے کے مطابق ایک غلط معنی معین کر رکھے ہیں۔ اب اس کے خلاف قرآن و حدیث میں جو کچھ اُن کو ملتا ہے بجائے اس کے کہ اس کی روشنی میں یہ اپنی غلط فہمی کی اصلاح کریں اس کی ایسی رکیک، اور غیر معقول تاویلیں کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے جو بداہتِ عقل کے بھی خلاف ہوں۔ ان کی "روشن عقلیں" اس لغو اور غیر معقول بات کو مان لینے کے لئے تو تیار ہو گئی ہیں بلکہ دوسروں کو بھی وہ یہی باور کرانا چاہتے ہیں کہ قرآنی آیات میں دوسرے اہل ایمان کے لئے دعا و استغفار کا جہاں جہاں ذکر آیا ہے اس سے مراد بس دعا و استغفار کا وظیفہ پڑھنا ہے۔ اور اس کا مقصد خود اپنے لئے وظیفہ خوانی کا ثواب حاصل کرنا ہی ہوتا ہے، اور جن بے چاروں کے لئے ان دعاؤں میں مغفرت و رحمت بظاہر مانگی جاتی ہے اُن کو اس سے کچھ بھی نفع نہیں ہوتا بلکہ نہیں ہو سکتا اور نہ وہ ملحوظ ہی ہوتا ہے۔ گویا جو کچھ اس دعا و استغفار کے موقع پر لفظوں میں کہا جاتا اور اللہ پاک سے مانگا جاتا ہے درحقیقت

وہ مطلوب نہیں ہوتا۔ بلکہ مقصود صرف اس "وظیفہ دعائیہ و استغفاریہ" کا ثواب حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اپنی غلط رائے پر بیجا اصرار کے بدنتیجہ کی غالباً یہ بدترین مثال ہے کہ اپنے خیالات و مزعومات سے نہ ہٹنے کیلئے آدمی اللہ پاک کی طرف ایسی غیر معقول بات منسوب کرنے کی جراُت کرنے لگے۔ تعالیٰ اللہ عما یقول الظالمون علواً کبیراً۔

ایسے ہٹ دھرموں کو یقیناً ہزار دلیلوں سے بھی مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔ الا یہ کہ خدا انہی کو ایسی توفیق دے کہ اپنے اس رویہ پر وہ خود ہی غور کریں۔ لیکن جو حضرات اپنی رائے اور اپنی ہویٰ کے بجائے اللہ اور رسول کی ہدایت کے اتباع ہی کو اپنا دستور بنائے ہوئے ہیں یہ آیات اُن کے اندر اس بات کا یقین پیدا کرنے کے لئے بالکل کافی ہیں کہ اہل ایمان کے لیئے اُن کے مرنے کے بعد بھی مغفرت و رحمت کی دعائیں اور التجائیں اللہ پاک سے کرنا عند اللہ ایک محمود اور مطلوب عمل اور گزر جانے والوں کے ساتھ احسان و ہمدردی کی یہ ایک پسندیدہ شکل ہے جس سے "رفتگان" کو انشا اللہ بہت کچھ نفع ہو سکتا ہے۔

قرآن پاک کی ان آیات بینہ کے علاوہ نماز جنازہ میں اموات کے لیئے دعا و استغفار کرنا اور بعد دفن قبر پر، اور اس کے بعد بھی اوقات مختلفہ میں بالخصوص قبرستان پر گزرتے ہوئے اہل قبور کے لیئے مغفرت و رحمت کی دعا مانگنا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلیماً و عملاً بتواتر قطعی ثابت ہے۔ (جس کی روایات اگر جمع کی جائیں تو یقیناً سیکڑوں سے متجاوز ہوں گی[علہ]) اور عہد رسالت سے آج تک طبقۃً بعد طبقۃ ساری امت کا اس پر عمل بھی رہا ہے۔ غور فرمایا جائے کہ کسی مسئلہ کے حق و ثابت عند اللہ ہونے کا اس سے بڑا معیار اور کیا ہو سکتا ہے۔ وماذا بعد الحق الا الضلال

مبحث دوم

(زندوں کے اُن اعمال خیر سے مردوں کا انتفاع جن کی فعلیت کا کسی طرح یہ مردے ذریعہ بنے ہوں)

دعا و استغفار کے علاوہ زندوں کے جن اعمال سے مردوں کا منتفع ہونا دلائل شرعیہ سے معلوم ہوتا ہے

علہ حافظ ابن قیمؒ "کتاب الروح" میں اس باب کی چند احادیث صحاح سے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

ودعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم للاموات فعلاً و تعلیماً ودعاء الصحابۃ والتابعین والمسلمین عصراً بعد عصر اکثر من ان یذکر و اشہر من ان ینکر (کتاب الروح صفحہ ۱۹۱)

اور اموات کے لیئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دعا فرمانا، اور اس کی اُنکی تعلیم دینا اور علی ہذا صحابہ و تابعین اور بعد کے مسلمانوں کا اپنے اپنے زمانے میں اموات کے لیے دعا و استغفار کرنا اتنی کثرت سے منقول ہے کہ بیان میں نہیں آسکتا اور اس کی شہرت اتنی عام ہے کہ کوئی منکر سے منکر اس کا انکار بھی نہیں کر سکتا۔ ۱۲۔

ان کو ابتداًء دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک وہ اعمال جن کا سبب کسی حیثیت سے یہ مرنے والا بنے ہوں۔ دوسرے وہ اعمال جن کی حیثیت یہ نہ ہو۔

اس مبحث دوم" میں صرف پہلی قسم کے اعمال کے متعلق چند احادیث ملاحظہ ہوں:۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

اذا مات الانسان انقطع عمله الا من ثلٰث، الا من صدقة جارية او علم ينتفع به او ولد صالح يدعو له

آدمی جب مرجاتا ہے تو اس کے اعمال کے سارے سلسلے منقطع ہو جاتے ہیں بجز ان تین سلسلوں کے ایک وہ صدقہ جاریہ جو اپنی حیات میں وہ کر گیا۔ دوسرے علم کا کوئی ایسا سلسلہ جس سے لوگوں کو فیض پہنچتا رہا ہے اور تیسرے اولاد صالح جو اس کے لئے دعائے خیر کرتی رہے (یعنی یہ تین سلسلے یا ان میں سے ایک دو بھی اگر مرنے کے بعد کوئی خوش نصیب چھوڑ گیا ہے تو ان سے اس کو برابر ثواب اور نفع پہونچتا رہیگا،

مثلاً ایک شخص نے کسی کو دین سکھایا، اُس کے بعد یہ سکھانے والا مر گیا پھر اُس کے اس شاگرد نے بہت سے لوگوں کو دین سکھایا اور علیٰ ہذا اس کے بعد بھی یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا تو سیکڑوں ہزاروں برس گزر جانے کے بعد بھی یہ علمی فیض اگر جاری رہیگا تو اس معلم اول کو بھی اُس کے ثواب کا حصّہ ملتا رہیگا۔ حالانکہ بعد میں اس تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری رکھنا ظاہر ہے کہ اس پہلے شخص کا ذاتی عمل نہ ہوگا، لیکن اس سلسلۂ خیر میں چونکہ یہ ایک واسطہ بنا تھا اس لیے اس سلسلہ سے ثواب اس کو برابر ملتا رہیگا۔ یہی حال صدقۂ جاریہ کا بھی ہے۔

اور سنن ابن ماجہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے ایک دوسری حدیث اس طرح مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

انما يلحق المومن من عمله وحسناته بعد موته علماً علمه ونشره او ولداً صالحاً تركه او مصحفاً ورثه او مسجداً بناه او بيتاً لابن السبيل بناه

مومن کو اس کے جن اعمال حسنہ کا ثواب اور نفع مرنے کے بعد بھی پہنچتا ہے وہ یہ ہیں۔ وہ علم دین جس کو وہ سکھا گیا اور پھیلا گیا۔ اور وہ نیک اولاد جس کو وہ اپنے پیچھے چھوڑ گیا، یا قرآن مجید کا نسخہ جو کسی کو ورثے

اونهراً اكراه اوصدقة اخرجها من ماله في صحته وحياته تلحقه من بعد موته -

اپنی میراث میں چھوڑا، یا مسجد، یا مسافر خانہ یا نہر، تالاب، کنواں، جو خلقِ خدا کی نفع رسانی کے لیے اپنی زندگی میں وہ بنوا گیا یا کوئی اور صدقہ جس کو اس نے اپنی حیات اور صحت کی حالت میں نکالا تھا اور خلق خدا کو بعد میں بھی اس سے نفع پہنچتا رہا، تو اس کا ثواب مرنے کے بعد بھی اس کو پہنچتا رہیگا۔

اور صحیح مسلم میں جریر بن عبداللہ کی روایت سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

من سن في الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اجورهم من شئ ومن سن في الاسلام سنة سيئةً كان عليه وزرها ووزر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اوزارهم شئ۔

جس نے اسلام میں نیکی کا کوئی طریقہ کھولا اور خیر کے کسی باب کا افتتاح کیا تو اس کو اپنی اس نیکی کا ثواب بھی ملے گا اور اس کے بعد جو اور لوگ اس پر عمل کرینگے اُن کے عمل کا بھی اجر و ثواب اس کو ملیگا بغیر اس کے کہ ان عاملین کے ثواب میں سے کچھ بھی کمی کی جائے۔ اور علیٰ ہذا اسلام میں جس نے کسی بدی کا راستہ کھولا تو اس کو اپنی اس بدی کی بھی سزا دی جائے گی اور اس کے بعد جتنے لوگ بھی اس بُرائی کو اختیار کریں گے اُن سب کے گناہوں کا بوجھ بھی اس پر ڈالا جائیگا بغیر اس کے کہ ان کے اپنے بوجھوں میں کوئی کمی کی جائے۔

اہل علم کو معلوم ہوگا کہ جریر بن عبداللہ کی اس روایت کے علاوہ بھی اس مضمون کی متعدد حدیثیں کتب صحاح میں مروی ہیں۔ بلکہ یہ دعویٰ بھی ان شاء اللہ غلط نہ ہوگا کہ احادیث میں یہ مضمون "حد شہرت" کو پہنچا ہوا ہے۔ لیکن چونکہ منکرین وصول ثواب کی اس نوع کے "عموماً" قائل ہی ہیں، اس لیے اس بحث کو طول دینا مناسب نہ ہوگا۔ اس باب کا اتنا ذکر بھی صرف مسئلہ کے استیعاب اور اطراف وجوانب کے احاطے کے لئے کر دیا گیا ہے۔

مبحث سوم

زندوں کے جن ایسے اعمال سے مُردوں کو نفع یا ثواب پہنچنا نصوص شرعیہ سے معلوم ہوا ہے جن کی فعلیت کا کسی حیثیت سے بھی وہ مردے سبب اور ذریعہ نہ بنے ہوں، اُن میں سے ایک تو وہ دُعا

واستغفار ہی ہے جس کا ذکر بحث اوّل میں کیا جا چکا ہے اور علاوہ اُن آیات و احادیث کے جن کی طرف وہاں اشارات کئے جا چکے ہیں اس کی ایک واضح ترین اور نقلی دلیل صحیحین کی وہ حدیث بھی ہے جس میں بیان ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر دو قبروں پر ہوا جن کے متعلق آپ کو منکشف ہوا کہ ان کے مدفون مردوں پر عذاب ہو رہا ہے[1]۔ آپ نے کھجور کی ایک تر شاخ منگوائی اور اس کے دو ٹکڑے کر کے ہر ایک میں ایک ایک گاڑھ دیا اور جب بعض رفقائے آپ سے پوچھا کہ یہ آپ نے کس لئے کیا تو فرمایا:

لعلّہ یخفف عنھما مالم ییبسا (بخاری ومسلم عن ابن عباس رضہ)	امید ہے کہ جب تک یہ شاخیں تر رہیں گی ان کے عذاب میں تخفیف رہے گی۔

اور صحیح مسلم کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ان معذبین کے لیے تخفیفِ عذاب کی دعا فرمائی تھی جو اس طور پر قبول کی گئی کہ تم ایک تر شاخ ان قبروں پر نصب کر دو جب تک وہ تر رہے گی ان کے عذاب میں تخفیف کر دی جائے گی، واللہ اعلم۔ بہر حال صحیحین کی اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ زندوں کی دعا واستغفار اور اُن کے کسی عمل سے مردوں کو نفع پہنچنے کا تجربہ اس عالم میں بھی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے ہو چکا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس کی اس حدیث کے علاوہ حضرت جابر بن عبداللہ سے بھی صحیح مسلم میں قریباً اسی مضمون کی ایک حدیث مروی ہے جس کے متعلق بعض خاص قرائن کی بنیاد پر حافظ ابن حجر کی رائے یہ ہے کہ وہ اس کے علاوہ اسی قسم کا دوسرا ایک واقعہ ہے[2]۔

دعا واستغفار کے علاوہ زندوں کے جن ایسے اعمال وافعال سے مردوں کا نفع مند ہونا نصوص شرعیہ سے معلوم ہوتا ہے، جن کا سبب کسی طرح اور کسی حیثیت سے بھی مردے نہ ہوئے ہوں وہ صدقات وخیرات اور دوسری عبادات کے ذریعہ ایصال ثواب کی صورتیں ہیں اور چونکہ زیادہ تر انکار آج کل انہی صورتوں کا کیا جا رہا ہے۔ اس لئے اس کو کسی قدر بسط وتفصیل سے لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری ہی کی ایک روایت ہے کہ آپ نے ان مبتلائے عذاب مردوں کی آواز سُنی ۱۲۔

[2] فتح الباری جزء اول صفحہ ۱۵۹ باب من الکبائر ان لایستتر من البول ۱۲۔

مبحث چہارم

جن طاعات وخیرات کے ذریعہ مردوں کو نفع پہنچانے (اور باصطلاح معروف ایصال ثواب کرنے) کا ارادہ کیا جائے اُن کی تین قسمیں ہوسکتی ہیں، یا تو وہ محض مالی ہیں (جیسے صدقہ، خیرات، قربانی وغیرہ) اور یا محض بدنی ہیں یعنی اُن میں پیسہ تو کوئی خرچ کرنا نہیں پڑتا۔ البتہ جسم و جان کو کچھ محنت و مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے (جیسے روزہ نماز، تلاوت قرآن پاک اور ذکر اللہ وغیرہ) اور یا ان دونوں سے مرکب ہیں، جیسے کہ حج، کہ اس میں روپیہ پیسہ بھی خرچ ہوتا ہے اور اس کے ارکان کی ادائیگی میں دوڑ دھوپ کی مشقت بھی اُٹھانی پڑتی ہے۔

بہت سی احادیث صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ان تینوں قسم کی عبادات کے ذریعہ فوت شدہ مومنین کو (بلکہ بعض صورتوں میں زندوں کو بھی) نفع اور ثواب پہونچایا جا سکتا ہے۔

عبادات مالیہ کے ذریعہ ایصال ثواب سب سے پہلے ہم خالص مالی عبادات کو لیتے ہیں۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:-

ان رجلاً قال للنبی صلی اللہ علیہ وسلم ان ابی مات وترک مالاً ولم یوص فھل یکفر عنہ (وضبطہ بعضھم فھل یکفی عنہ) ان اتصدق عنہ؟ قال نعم۔[1]

ایک شخص آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس نے دریافت کیا کہ میرے باپ کا انتقال ہوگیا ہے اور اپنے ترکہ میں انہوں نے مال چھوڑا ہے اور کوئی وصیت کی نہیں ہے تو اگر میں اُن کی جانب سے کچھ صدقہ خیرات کردوں تو کیا میرا یہ صدقہ ان کے لیے کفایت ہوجائیگا (یا مطلب یہ کہ کفارہ ہوجائیگا؟) آپ نے فرمایا کہ ہاں۔

یہ حدیث اثبات مدعا کے لیے کسی توضیح و تقریر کی محتاج نہیں ہے۔ ایک شخص مرگیا ہے اُس نے کوئی وصیت بھی نہیں کی ہے۔ جس کے بعد قانون شرعی کے مطابق اس کا متروکہ مال وارثوں کی طرف منتقل ہوگیا، اب اس کا لڑکا پوچھتا ہے کہ میں اگر اپنے مرحوم باپ کی طرف سے کچھ صدقہ خیرات

---

[1] صحیح مسلم کتاب الوصیۃ ۱۲۔

کروں تو یہ ان کے لیے کفارہ ہو سکتا ہے یا نہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ہاں یہ ہو سکتا ہے۔

اور مسند احمد میں حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے کہ میرے دادا عاص بن وائل نے سو اونٹوں کی قربانی کی نذر مانی تھی (جس کو وہ پورا نہ کر سکے) تو ان کی طرف سے اُن کے ایک بیٹے ہشام بن عاص نے پچپن اونٹ ذبح کئے۔ پھر (میرے والد) عمرو بن عاص نے اسلام لانے کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارہ میں سوال کیا (غالباً سوال کا منشا یہ تھا کہ اگر بقیہ پینتالیس اونٹ میں اُن کی طرف سے قربان کر دوں تو کیا اس سے اُن کو کچھ نفع ہوگا؟) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا:۔

اما ابوک فلو اقر بالتوحید فصمت وتصدقت عنہ نفعہ ذالک[۱]

تمہارے باپ اگر لا الٰہ الا اللہ کے ماننے والے ہوتے (یعنی مومن ہوتے) اور پھر تم اُن کی طرف سے روزے رکھتے یا صدقہ وخیرات کرتے تو اس سے اُن کو نفع ہوتا۔

اور صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ:۔

ان رجلا اتی النبی صلی اللہ علیہ ... فقال یا رسول اللہ ... امی افتتلت نفسہا ولم توص واظنہا لو تکلمت تصدقت افلہا اجر ان تصدقت عنہا قال نعم[۲]

ایک شخص خدمت نبوی میں حاضر ہوئے اور انہوں نے عرض کیا کہ میری والدہ اچانک انتقال کر گئیں اور انہوں نے کوئی وصیت نہیں کی ہے اور میرا گمان ہے کہ اگر انہیں بات کرنے کا موقع ملتا تو وہ کچھ صدقہ کر جاتیں، تو اب اگر میں ان کی طرف سے کچھ صدقہ خیرات کردوں تو کیا ان کو ثواب پہونچیگا۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں!

بعض شارحین حدیث کو اگرچہ شبہ ہوا ہے کہ یہ سوال کرنے والے صحابی سعد بن عبادہ ہی تھے

[۱] "کتاب الروح" لابن القیم ص۱۹۲ بحوالہ مسند احمد ۱۲

[۲] صحیح بخاری باب ما یستحب لمن یتوفی فجاءۃ ان یتصدقوا عنہ۔ وصحیح مسلم باب وصول الصدقۃ عن المیت

جن کے واقعہ کا ذکر آگے آرہا ہے، لیکن قرائن سے علامہ بدرالدین عینی شارح بخاری کی یہ رائے زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے کہ یہ سعد کے علاوہ کوئی دوسرے صحابی ہیں اور یہ دوسرا واقعہ ہے واللہ اعلم۔
اور صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت سعد کا واقعہ حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت سے اس طرح مروی ہے :-

ان سعد بن عبادة رضی اللہ عنہ اخا بنی ساعدة توفیت امہ وھو غائب فاتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ ان امی توفیت وانا غائب عنھا فھل ینفعھا شئ ان تصدقت عنھا؟ قال نعم۔ قال فانی اشھدک ان حائطی المخراف صدقة علیھا۔ [۱]

کہ سعد بن عبادہ کی غیبت میں ان کی والدہ کی وفات ہوگئی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میری عدم موجودگی میں میری ماں کا انتقال ہوگیا ہے تو کیا اگر میں ان کی طرف سے کچھ صدقہ کروں تو یہ ان کے لئے نافع ہوگا؟۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں! تو انھوں نے عرض کیا کہ میں آپ کو گواہ کرتا ہوں کہ میرا باغ "مخراف" میری ماں پر سے صدقہ ہے۔

نیز صحیح بخاری ہی میں حضرت عبداللہ بن عباس ہی کی ایک دوسری روایت اس سلسلہ میں یہ بھی ہے:

ان سعد بن عبادة استفتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال ان امی ماتت وعلیھا نذر فقال اقضہ عنھا۔ [۲]

کہ سعد بن عبادہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میری والدہ فوت ہوگئیں۔ اور ان کے ذمہ ایک نذر تھی (جس کو وہ ادا نہیں کرسکیں تو کیا میں ان کی طرف سے اس کو ادا کرسکتا ہوں) حضور نے فرمایا ہاں تم ان کی طرف سے اس نذر کو ادا کردو۔" [۳]

[۱] حضرت سعد کی ان والدہ کا نام عمرہ تھا سنہ ۵ھ میں ان کی وفات ایسے وقت ہوئی جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ دومۃ الجندل کے سلسلہ میں مدینہ سے باہر تھے اور ان کے بیٹے سعد بن عبادہ بھی آپکے ساتھ غزوہ ہی میں تھے (فتح الباری، عمرۃ انقاری) ۱۲۔
[۲] صحیح بخاری (باب الاشہاد فی الوقف والصدقہ) [۳] صحیح بخاری باب یستحب لمن توفی فجاءۃ ان یتصدقوا عنہ وقضاء النذور عن المیت ۱۲ [۴] سنن نسائی کی ایک روایت سے۔ اس نذر کے متعلق یہ تفصیل بھی معلوم ہوجاتی ہے کہ یہ نذر غلام آزاد کرنے کی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد کو ان کی طرف سے غلام آزاد کرنے کا حکم دیا۔ (فتح الباری)

واضح رہے کہ ان دونوں روایتوں میں کوئی تناقض اور تعارض نہیں ہے واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سعد نے ایک دفعہ تو صدقہ کے متعلق سوال کیا تھا جس کا ذکر پہلی روایت میں ہے اور دوسری دفعہ نذر کے بارے میں دریافت کیا تھا، جس کا ذکر دوسری روایت میں کیا گیا ہے۔

ایک تیسری روایت اس بارہ میں اور بھی وارد ہوئی جس میں مذکور ہے کہ حضرت سعد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ والدہ ماجدہ کا انتقال ہوگیا ہے تو ان کی طرف سے کون سا صدقہ زیادہ بہتر اور افضل ہوگا؟ آپ نے فرمایا "الماء" (یعنی اللہ کی مخلوق کے لیے پانی کا انتظام کرنا)۔ چنانچہ حضرت سعد نے ایک کنواں تیار کرا کے اپنی والدہ کی طرف سے اس کو وقف عام کردیا[1]"

یہ روایت سنن نسائی و ابی داؤد میں خود حضرت سعد ہی سے مروی ہے، لیکن اس کی اسناد میں ایک انقطاع[2] ہے۔ تاہم صحیح بخاری کی مذکورۂ بالا روایات سے متعارض یہ بھی نہیں ہے کیونکہ ہو سکتا ہو کہ حضرت سعد نے اپنے باغ مخراف کے علاوہ اپنی والدہ کی طرف سے کنواں بھی وقف کیا ہو۔ جس طرح آج بھی لوگ اپنے ماں باپ کی طرف سے انواع و اقسام کے صدقات و خیرات کے ذریعہ ایصال ثواب کرتے رہتے ہیں۔

ایصال ثواب کے بعض منکرین ان روایات کے اس اختلاف کو اصطلاحی "اضطراب" قرار دے کر حدیث کو ناقابلِ احتجاج قرار دینے کی کوشش کرتے بھی دیکھے گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے "اضطراب فی المتن" کی حقیقت کو بھی سمجھنے کی کوشش نہیں فرمائی ہے۔ یہاں اضطراب کا دعویٰ اس وقت چل سکتا ہے جبکہ یہ سارے سوال و جواب جو مندرجۂ بالا تینوں حدیثوں میں مذکور ہیں

---

[1] اس حدیث کی بعض روایات میں یہ اضافہ بھی ہے کہ اس کے راوی حسن بصری نے یہ حدیث سناتے وقت اپنے شاگردوں سے کہا فتلک سقایۃ آل سعد بالمدینۃ "(مدینہ میں "سقایۂ آل سعد" کے نام سے پانی کی جو سبیل ہے یہ دراصل وہی ہے)، اس سے معلوم ہوا کہ حضرت سعد نے اپنی والدہ کی جانب سے جو کنواں وقف کیا تھا بعد میں وہی "سقایہ آل سعد" کے نام سے بھی مشہور تھا۔ حضرت حسن بصری کی اس شہادت کے بعد ظاہر ہے کہ اس حدیث کا استنادی درجہ کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔ ۱۲۔

[2] سنن نسائی اور سنن ابی داؤد میں سعد بن عبادہ سے اس حدیث کو روایت کرنے والے سعید بن المسیب اور حسن بصری ہیں حالانکہ حضرت سعد بن عبادہ کی وفات کے وقت تک بھی یہ دونوں صاحبان سن شعور کو نہیں پہنچے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ درمیان کے ایک راوی کا نام ذکر سے رہ گیا ہے۔ اسی کو اصطلاح محدثین میں "انقطاع" کہتے ہیں۔ ۱۲۔

ایک ہی مجلس کے ایک ہی سوال و جواب کے متعلق راویوں کے مختلف بیانات ہوں، لیکن جب کہ اس کی کوئی دلیل نہیں ہے تو پھر اس کو "اضطراب" قرار دینا اصولِ فن سے ناواقفی کی ہی دلیل ہے۔ اس میں کوئی استحالہ بلکہ استبعاد بھی نہیں ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ نے مختلف دفعات میں یہ سوالات کئے ہوں اور جوابات پا کر ان کی تعمیل کرتے رہے ہوں۔ غرض یہ تینوں روایتیں جیسا کہ ان کے مضامین سے ظاہر ہے الگ الگ مستقل حدیثیں ہیں۔ ومن ادعی خلافہ فعلیہ البیان۔

قربانی کے ذریعہ ایصال ثواب عبادات مالیہ کے ذریعہ ایصال ثواب کا ایک واضح ثبوت وہ متعدد احادیث بھی ہیں جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی آل اور اپنی امت کی طرف سے قربانی کرنا ثابت ہوتا ہے۔ ان میں سے چند یہ ہیں :-

"صحیح مسلم" میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار عید اضحیٰ کے موقع پر ایک اچھے موٹے تازے سینگوں والے مینڈھے کی قربانی کی، اور اس کو ذبح کرتے وقت آپ نے کہا۔

بسم اللہ اللھم تقبل من محمد وآل محمد ومن امۃ محمد (صحیح مسلم کتاب الضحایا)	اے اللہ اس کو قبول فرما میری طرف سے اور میری آل اور میری امت کی طرف سے۔

اس بارہ میں ایک دوسری حدیث حضرت جابر بن عبداللہ سے بھی مروی ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ ایک عید قرباں کے موقع پر آں حضرت نے دو مینڈھوں کی قربانی کی اور آیت انی وجھت وجھی للذی فطر السموات والارض الخ تلاوت فرمانے کے بعد آپ نے " اللھم منک ولک عن محمد وامتہ بسم اللہ واللہ اکبر کہتے ہوئے ذبح کیا۔ (ابوداؤد، باب مایستحب من الضحایا)۔

"سنن ابی داؤد" کے علاوہ "مسند احمد"، "سنن ابن ماجہ" اور "دارمی" میں بھی یہ روایت اسی طرح ہے اور "سنن ابن ماجہ" اور "مصنف عبدالرزاق" میں حضرت عائشہ اور حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہما) سے مروی ہے :-

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا اراد ان یضحی اشتری کبشین	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب قربانی کرنی ہوتی تو آپ بڑے موٹے تازے، سینگوں والے

عظیمین سمینین اقرنین املحین موجوئین فذبح احدھما عن محمد وآل محمد والآخر عن امتہ من شہد للہ بالتوحید ولہ بالبلاغ۔

(فتح الباری پ۲۳ صفحہ ۳۲۶ طبع ہند)

سیاہی مائل سفید رنگ کے دو خصی مینڈھے منگواتے، ایک کی اپنے اور اپنے اہل بیت کی جانب سے قربانی کرتے اور دوسرے کی اپنے اُن اُمتیوں کی طرف سے جو اللہ کی وحدانیت اور آپ کی تبلیغ رسالت کی شہادت دیں۔

اس مضمون کی روایات حضرت جابرؓ۔ حضرت عائشہ اور حضرت ابوہریرہ کے علاوہ اور بھی چند صحابہ مثلاً حضرت ابورافع۔ حضرت حذیفہ بن اسید غفاری، حضرت ابوطلحہ انصاری اور حضرت انس بن مالک سے ۔مسند احمد، مسند ابویعلی، مصنف ابن ابی شیبہ اور مستدرک حاکم وغیرہ میں مروی ہیں۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فتح الملہم شرح صحیح مسلم ج ۳ ص ۳۵)

یہ سب روایات اگرچہ بجائے خود بہ اصطلاح محدثین "اخبار آحاد" ہی ہیں لیکن ان سب کے مجموعہ سے اُس شخص کو جو علم حدیث سے کچھ بھی مناسبت رکھتا ہو۔ اس بات کا اضطراری یقین حاصل ہو جانا ضروری ہے کہ آں حضرت نے اُمت کی جانب سے قربانی فرمائی ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ آپ نے اُس قربانی کا ثواب اُمت کو بخشا ہے۔

اس کے متعلق بعض منکرین کا یہ دعویٰ کرنا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "خصوصیت" تھی محض بے دلیل دعویٰ ہے۔ کسی چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت قرار دینے کے لیے مستقل دلیل کی ضرورت ہے۔ اور یہاں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ سنن ابی داؤد اور جامع ترمذی میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی مرتضیٰ کو وصیت کی تھی کہ وہ آپ کی طرف سے قربانی کیا کریں۔ چنانچہ حضرت علی کا معمول تھا کہ وہ عید قرباں پر ایک مینڈھے کی قربانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کیا کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرتؐ کے علاوہ دوسرے مسلمان بھی دوسروں کی طرف سے قربانی کر سکتے ہیں۔ ورنہ اگر قربانی کے ذریعہ دوسروں کو ثواب پہونچانا حضور کی خصوصیت ہوتی تو آپ حضرت علی کو اس کی وصیت نہ فرماتے۔

بعض منکرین اس روایت کے بارہ میں کہا کرتے ہیں کہ حضرت علی مرتضیٰ کی یہ قربانی حضور کی طرف سے اس لیے صحیح تھی کہ وہ حضور کی وصیت سے تھی، تو گویا وہ حضرت علی کا نہیں بلکہ آپ کا

فعل تھا۔ لیکن یہ صریح مغالطہ ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کے پاس اس کام کے لیے کوئی رقم تو جمع کی ہی نہیں تھی۔ پس آنحضرت کا فعل صرف وصیت ہے اور قربانی حضرت علیؓ کا عمل ہے۔ اور بحث اس قربانی ہی کے اجر و ثواب میں ہے۔ پس یہ قربانی جو حضرت علیؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اپنے مال سے کرتے تھے جب ہی صحیح ہو سکتی ہے جبکہ اصولاً اس کو تسلیم کرلیا جائے کہ ایک کے صدقہ اور ایک کی قربانی کا ثواب اور نفع دوسرے کو پہنچ سکتا ہے، ورنہ اگر یہ اصول نہ مانا جائے جیسا کہ ہمارے مخالفین کا خیال ہے تو پھر حضرت علی کی قربانی ہی غلط ہوگی۔ بلکہ معاذ اللہ حضور کی وصیت بھی غلط ہوگی۔ بہر حال یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ وصیت نے یہاں ایصال ثواب کو صحیح نہیں کیا ہے، بلکہ یہ وصیت ہی "ایصال ثواب" کی بنیاد پر صحیح ہو سکتی ہے (تاملوا فان الفرق دقیق)

بہر حال مذکورۂ بالا احادیث کے علاوہ حضرت علی مرتضیٰ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی کی یہ وصیت اور حضرت علی کا دائمی عمل اس امر کا ثبوت ہے کہ ہم دوسروں کی طرف سے مالی عبادات کر سکتے ہیں یعنی اپنے صدقات و قربانی وغیرہ دوسروں کو بخش سکتے ہیں، بالخصوص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی کر سکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بہت سے اعمال خیر کئے۔ مثلاً حضرت عبد اللہ بن عمر سے مروی ہے کہ انھوں نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے متعدد عمرے کئے۔ (فتح الملہم ج ۳ صفحہ ۹۹)

نیز آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا دوسروں کی جانب سے بھی اس قسم کے اعمال خیر کرنے کا ثبوت صحابہ کرام سے ملتا ہے۔ علامہ بدر الدین عینی عمدۃ القاری شرح بخاری میں ناقل ہیں:۔

قال ابن المنذر وقد ثبت عن عائشۃ	امام حدیث ابن المنذر کا بیان ہے کہ حضرت عائشہ
انھا اعتقت عبدا عن اخیھا عبد الرحمٰن	سے یہ چیز پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ انھوں نے اپنے

ف یہاں ایک دلچسپ قابل ذکر لطیفہ یہ ہے کہ بعض منکرین کے سامنے جب یہ حدیث پیش کی گئی تو انھوں نے یہی کہا کہ حضرت علی کو چونکہ حضور کی وصیت تھی اس لیے وہ گویا حضور ہی کا عمل ہوا اور اس لیے اس کا ثواب آں حضرت کو ملنا صحیح ہے۔ لیکن یہ کہنے کے باوجود وہ اس کے قائل نہیں ہوتے کہ اس طرح اگر آج کوئی مرنے والا اپنے کسی عزیز کو ایصال ثواب کی وصیت کر جائے اور وہ صدقہ وغیرہ سے ایصال ثواب کرے تو یہ ثواب اس مردے کو پہنچیگا ۱۲۔

وکان مات ولم یوص

عمدہ ص ۵۵/۱۴۲

بھائی عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی وفات کے بعد ان کی طرف سے بغیر ان کی کسی وصیت کے ایک غلام آزاد کیا

نیز اسی عمدہ (شرح بخاری) میں علامہ عینی ایک دوسری جگہ محدث ابن ماکولا کی تخریج سے حضرت انس کی یہ حدیث نقل کرتے ہیں:-

انه قال سألت رسول الله صلی الله علیه وسلم فقلت انا ندعو لموتانا ونتصدق عنهم ونحج فهل یصل ذالك الیهم فقال انه یصل الیهم ویفرحون به کما یفرح احدکم بالهدیة عینی ص ۲۲/۷

کہ میں نے (انس نے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ہم اپنے مردوں کے لیے جو دعائیں کرتے ہیں اور جو صدقہ خیرات یا حج ان کی جانب سے کرتے ہیں تو کیا یہ ان کو پہونچ جاتا ہے؟ حضرت نے فرمایا ہاں پہنچتا ہے اور جس طرح تم لوگوں کو کوئی ہدیہ پاکر خوشی ہوتی ہے اسی طرح تمہارے ان تحفوں سے تمہارے اُن مردوں کو خوشی حاصل ہوتی ہے۔

ان تمام احادیث سے جو یہاں تک درج کی گئیں کتنے واضح طور پر ثابت ہے کہ مالی عبادات۔ صدقات وخیرات اور قربانی وغیرہ اگر مردوں کی طرف سے کی جائیں تو یہ شرعاً درست ہے، اُن کو مردوں کو نفع اور ثواب ہونا برحق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو یہ بتلایا اور آپ کی تعلیم کے مطابق صحابہ نے اس پر عمل کیا۔ عہد نبوی میں بھی اور اس کے بعد بھی۔

صدقات وخیرات وغیرہ مالی عبادات کا ثواب مردوں کو بخشنے اور اُس سے اُن کو نفع پہنچنے کا یہ ثبوت چونکہ نہایت واضح اور غیر مشکوک ہے اسی لیے جن ائمہ سلف کو بدنی عبادات نماز روزہ تلاوت قرآن مجید وغیرہ) سے ایصال ثواب میں کلام بھی ہے وہ بھی مالی عبادات میں قائل ہیں۔ بہر حال کم از کم مالی عبادات کی حد تک یہ مسئلہ ہمیشہ سے جمہور امت میں متفق علیہ رہا ہے۔ امام مسلم نے اپنی "صحیح" کے مقدمہ میں امت کے جلیل القدر امام، عبداللہ بن المبارک سے نقل کیا ہے کہ ابو اسحٰق طالقانی نے جب اُن سے مشہور حدیث" ان من البر بعد البر ان تصلی لابویک مع صلواتك وتصوم لهما مع صومك" کے متعلق سوال کیا تو اُس کی اسناد میں

انقطاع ہونے کی وجہ سے اس حدیث کو تو انھوں نے مجروح قرار دیا، مگر ساتھ ہی فرمایا۔ ولکن لیس فی الصدقۃ اختلاف (یعنی صدقہ کے ذریعہ ایصال ثواب کرنا متفق علیہ ہے جس میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں ہے)، اہل علم جانتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن المبارک کی طرف سے اجماع کی یہ شہادت کتنا وزن رکھتی ہے۔

امام نووی حضرت عبداللہ بن مبارک کے اس قول کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

معناہ ان ھذا الحدیث لا یحتج بہ ولکن من اراد بر الوالدیہ فلیتصدق عنھما فان الصدقۃ تصل الی المیت وینتفع بھا بلا خلاف بین المسلمین۔

(نووی شرح مقدمہ مسلم)

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس حدیث کے متعلق ابواسحاق نے سوال کیا وہ تو قابلِ احتجاج نہیں ہے، لیکن جو کوئی اپنے والدین کے ساتھ نیکی کرنا چاہے تو اُس کو چاہیئے کہ وہ ان کی طرف سے صدقہ خیرات کرے کیونکہ صدقہ کا ثواب اور نفع موتی کو پہنچنے میں اہل اسلام کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔

مبحث پنجم ۵

نماز روزہ وغیرہ بدنی عبادت کے ذریعہ ایصال ثواب

بدنی عبادات کے بارہ میں خود ائمہ اہل سنت میں مشہور اختلاف ہے امام مالک اور امام شافعی کو (بنا بر قول مشہور) اس سے انکار ہے کہ نماز روزہ وغیرہ بدنی عبادات کا ثواب کسی دوسرے کو پہنچ سکے، لیکن امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اور امام احمد کا مسلک یہی ہے کہ صدقہ وخیرات اور حج وقربانی کی طرح نماز روزہ اور تلاوۃ قرآن مجید

لہ اس حدیث کو ابواسحٰق نے شہاب بن خراش سے اور اونھوں نے حجاج بن دینار سے روایت کیا ہے، آگے حجاج بن دینار اس کو براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، حالانکہ وہ اتباعِ تابعین میں سے ہیں تو ظاہر ہے کہ اُن کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کم از کم دو واسطے ضرور ہوں گے۔ بس یہی وہ علت جس کا نام محدثین کی اصطلاح میں انقطاع ہے اور عبداللہ بن مبارک نے اسی وجہ سے اس حدیث کو ناقابل احتجاج قرار دیا ہے ۱۲۔منہ۔

وغیرہ جملہ بدنی عبادات کا ثواب بھی مردوں کو پہنچ سکتا ہے اور امام ابن قیم نے "کتاب الروح" میں اس مسلک کو جمہور سلف کی طرف منسوب کیا ہے (صفحہ ۱۸۸)

اگرچہ اس بارہ میں مالی عبادات کی طرح دلائل بالکل یکطرفہ اور فیصلہ کن نہیں ہیں (اور اسی وجہ سے اس میں ائمہ سلف کی دو رائیں ہو گئی ہیں) تاہم جو حضرات اس کے قائل ہوئے ہیں وہ دلائل ہی سے قائل ہوئے ہیں، اور یہ دلائل اتنے قوی ہیں کہ امام بیہقی، جو امام شافعی کے غالباً سب سے بڑے وکیل اور حامی ہیں۔ اُنھوں نے بھی اس بارہ میں اِن دلائل کی ہی بنا پر امام شافعی کی تحقیق سے اختلاف کرتے ہوئے یہی رائے ظاہر کی ہو کہ اموات کی طرف سے مالی عبادات کی طرح ہی بدنی عبادات کا بھی کرنا اور اموات کو اُن سے بھی نفع اور ثواب پہنچنا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اور اس لیئے یہی حق ہے۔" حافظ ابن حجر فتح الباری میں امام بیہقی سے ناقل ہیں :-

(قال البیہقی فی الخلافیات ھذہ المسئلۃ ثابتۃ لا اعلم خلافاً بین اھل الحدیث فی صحتھا فوجب العمل بھا۔ ثم ساق بسندہ الی الشافعی قال "کل ما قلت وصح عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم خلافہ فخذوا بالحدیث ولا تقلدونی"۔ (فتح الباری جز ، ص ۲۸۵)

یہ مسئلہ (یعنی اموات مسلمین کی طرف سے نماز روزہ کرنا) صراحۃً احادیث سے ثابت ہے اور اس کے ثبوت کی صحت کے بارہ میں مجھے معلوم نہیں محدثین میں کوئی اختلاف ہو لہذا اس کے مطابق عمل واجب ہے (اور کیوں نہ ہم اس کو اختیار کریں جبکہ) خود امام شافعی کا ارشاد ہے کہ "میں جو کچھ کہوں اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث اُس کے خلاف ثابت ہو جائے تو اُس حدیث پر عمل کیا جائے اور ہرگز ہرگز پھر میرے فتوی کی تقلید نہ کی جائے۔"

امام شافعی رحمہ اللہ نے بعض اُن احادیث پر مفصل کلام بھی کیا تھا جن سے اموات کی طرف سے روزے رکھنے کا ثبوت ہوتا ہے۔ امام بیہقی نے اپنی مشہور کتاب "معرفۃ السنن والآثار" میں (جس کا موضوع ہی گویا حنفیت کے مقابلہ میں شافعیت کی حمایت ہے) اپنے امام کے اس کلام کا مفصل اور

مدلل جواب دیا ہے۔ امام شافعی کے اس کلام اور امام بیہقی کے جواب کو حافظ ابن القیم نے کتاب الروح میں بھی نقل کیا ہے۔ (کتاب الروح صفحہ ۲۲۲)۔

بہرحال اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ "بدنی عبادات" کے ذریعہ ایصال ثواب کے بارہ میں مالی عبادات کی طرح نہ تو ائمہ کا اتفاق ہے اور نہ دلائل ہی ویسے یک طرفہ اور فیصلہ کن ہیں۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ اس کے بارہ میں نصوص بالکل نہوں اور صرف مالی عبادات پر قیاس ہی کر لیا گیا ہو، جیسا کہ بہت سوں کا خیال ہے۔ بلکہ اس بارہ میں مستقل احادیث موجود ہیں اور وہ ایسی صریح اور قوی ہیں کہ ان کی بنیاد پر امام شافعی کے بیہقی جیسے زبردست حامی اور وکیل نے بھی اس مسئلہ میں ان کا ساتھ چھوڑ دینا ضروری سمجھا۔ اور متاخرین شافعیہ کا تو عام رجحان ہی اس طرف ہے جیسا کہ ان کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ احادیث صحیحین میں بھی ہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔

من مات وعليه صيام صام عنه وليه۔ (صحيح بخاری كتاب الصوم وصحيح مسلم باب قضاء الصوم عن الميت)۔

جو شخص ایسی حالت میں مرجاوے کہ اس کے ذمہ کچھ روزے ہوں تو اس کی طرف سے اس کا ولی روزے رکھ سکتا ہے۔

اور صحیح بخاری وصحیح مسلم کے اسی باب میں حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے۔

جاءت امرأة الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقالت يارسول الله ان امى ماتت وعليها صوم نذر افاصوم عنها قال ارأيت لو كان على امك دين فقضيته اكان يؤدى ذلك عنها قالت نعم قال فصومى عن امك

(رواه البخاری ومسلم واللفظ له)

ایک عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا، میری والدہ کا انتقال ہو گیا ہے اور ان کے ذمہ نذر کے کچھ روزے تھے، تو کیا میں ان کی طرف سے روزے رکھ سکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا بتلاؤ اگر تمہاری ماں پر کچھ قرضہ ہوتا، اور تم اس کو ادا کر دیتیں تو کیا ان کی طرف سے وہ ادا ہو جاتا، سائلہ نے عرض کیا ہاں قرضہ تو ادا ہو جاتا! آپ نے فرمایا تو اسی طرح اپنی ماں کی طرف سے روزے بھی رکھ سکتی ہو!

اور صحیح مسلم کے مذکورۂ بالا باب ہی میں حضرت بریدہ صحابی سے مروی ہے:-

بینا انا جالس عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذ اتتہ امرأۃ فقالت انی تصدقت علی امی بجاریۃ وانھا ماتت قال فقال وجب اجرک وردھا علیک المیراث قالت یا رسول اللہ انہ کان علیھا صوم شھر افا صوم عنھا قال صومی عنھا قالت انھا لم تحج قط افاحج عنھا قال حجی عنھا

(صحیح مسلم باب قضاء الصوم عن المیت)

میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک عورت حاضر ہوئی اور اُس نے عرض کیا کہ میں نے اپنی ایک کنیز اپنی والدہ پر صدقہ کردی تھی (یعنی بہ نیت ثواب ہبہ کردی تھی) اور اب میری والدہ کا انتقال ہوگیا ہے؟ حضور نے فرمایا تمہیں ہبہ کا ثواب مل گیا، اور قانون وراثت کے ذریعہ اب وہ باندی پھر تمہاری ملکیت میں آگئی، پھر اُس عورت نے عرض کیا، کہ میری ماں کے ذمہ ایک مہینے کے روزے بھی تھے تو کیا میں ان کی طرف سے روزے رکھ سکتی ہوں؟- آپ نے فرمایا ہاں ان کی طرف سے روزے رکھ دو۔

پھر اُس عورت نے عرض کیا کہ میری والدہ نے کبھی حج بھی نہیں کیا تو کیا میں ان کی طرف سے حج بھی کرسکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا ہاں! حج بھی ان کی طرف سے کردو۔

روزے کے بارہ میں یہ تینوں روایتیں بالکل صاف اور صریح ہیں۔ البتہ ان کے بارے میں چند چیزیں توضیح طلب ہیں۔

اوّل یہ کہ درمیان کی حدیث جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے اس کی مختلف روایات میں چند اختلافات ہیں جن کی بنیاد پر قاضی عیاضؒ وغیرہ نے اس کو "مضطرب" قرار دیا ہے۔ لیکن حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں باوجود اپنی سخت شافعیت کے، اِن اختلافات کو حل کرکے اضطراب کو دور اٹھایا ہے اور حدیث سے استدلال کو صحیح قرار دیا ہے (فتح الباری ص ۱۵۵ ج ۴)

لیکن اگر حافظ کا عل کسی کو مطمئن نہ کر سکے تو یہ تو ظاہر ہی ہے کہ روایتوں کا وہ اختلاف صرف حضرت ابن عباس والی حدیث میں ہے، باقی حضرت عائشہ اور بریدہ کی دونوں حدیثیں صاف ہیں۔ وکفیٰ بھما حُجَّۃً۔

دوسری بات قابلِ ذکر یہاں یہ ہے کہ ان احادیث کے مقابلہ میں حضرت عائشہ اور حضرت ابن عباس کے بعض اقوال پیش کئے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک موتی کی طرف سے روزے تو نہیں رکھے جا سکتے اور نہ نمازیں پڑھی جا سکتی ہیں، ہاں صدقہ دیا جاسکتا ہے (جیسا کہ امام شافعی اور امام مالک کی رائے ہے) ان آثار کو عبدالرزاق، نسائی اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ (فتح الباری صد ۲۸۵ جز ۴)

اس کے متعلق ایک گزارش تو یہ ہے کہ امام بیہقی نے "کتاب المعرفۃ" میں حضرت عائشہ وابن عباس کے ان فتووں کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

وفی ما روی عنھما فی النھی عن الصوم عن المیت نظر۔	صوم عن المیت سے نہی کے بارہ میں حضرت عائشہ وابن عباس کے فتووں کی روایات محل نظر ہیں۔

اور حافظ ابن حجر فتح الباری میں فرماتے ہیں:۔

ان الآثار المذکورۃ عن عائشۃ وعن ابن عباس فیھا مقال ولیس فیھا ما یمنع الصیام الا الاثر الذی عن عائشۃ وھو ضعیفٌ جدًّا۔	حضرت عائشہ وابن عباس کے ان آثار میں کلام ہے، نیز ان سے میت کی جانب سے روزوں کی صریح ممانعت بھی نہیں نکلتی۔ ہاں حضرت عائشہ والے اثر میں بیشک صریح ممانعت ہے لیکن وہ اسنادی حیثیت سے بہت ہی ضعیف ہے

خیر یہ جواب تو اسناد وعلل کے مباحث سے متعلق ہے۔ دوسرا آسان اور صاف جواب دبنا بر تسلیم یہ ہے کہ صحیحین کی جو مرفوع حدیثیں اوپر پیش کی گئیں (جن سے موتی کے لیے روزے رکھنا صراحۃً ثابت ہے) اور حضرت عائشہ وابن عباس کے وہ اقوال جن میں اموات کی جانب سے روزے نماز کی نفی کی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک ان میں توفیق وتطبیق اس طرح ممکن ہے کہ اثبات کی احادیث کو

"ایصال ثواب" پر محمول کیا جائے۔ اور نفی والے آثار کو "نیابت" پر۔ گویا ہماری پیش کردہ صحیحین کی احادیث کا منشا یہ ہو کہ روزے نماز کے ذریعہ اموات کو ثواب پہونچایا جا سکتا ہے اور حضرت عائشہ وابنِ عباس کے فتووں کا مطلب یہ لیا جائے کہ نماز روزے میں زندے مُردوں کی نیابت نہیں کر سکتے۔ یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ جن لوگوں کے ذمہ روزے یا نمازیں فرض ہوں اور وہ ادا کئے بغیر مر جائیں تو ان کے زندے پس ماندگان ان کی طرف سے وہ فرض روزے رکھدیں اور نمازیں پڑھ دیں تو ان مرنے والوں کا فرض اتر جائے جیسا کہ نیابت کا مقتضیٰ ہے۔ اس توجیہ سے تعارض وتناقض بھرے سے اُٹھ جاتا ہے اور "ایصال ثواب" و "نیابت" کا یہ فرق ہے بھی بالکل واقعی۔ فقہ حنفی میں تو یہ چیز صراحت کے ساتھ اسی طرح مذکور ہے۔ صاحب "درمختار" کے قول "وان صام او صلی عنہ لا" کی شرح کرتے ہوئے علامہ ابن عابدین نے لکھا ہے:-

"معناہ لا یجوز قضاء عما علی المیت والا فلو جعل لہ ثواب الصوم والصلوٰۃ یجوز"	کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میت کے ذمہ جو نمازیں یا روزے فرض تھے اُن کی ادائگی کے خیال سے زندوں کا اُس کی جانب سے روزے رکھنا یا نمازیں پڑھنا صحیح نہیں ہے لیکن اگر روزے رکھ کے یا نمازیں پڑھ کے اُس کو ثواب پہنچا دو تو یہ جائز ہے۔

بہر حال مذکورۂ بالا احادیث وآثار میں اس طرح تطبیق ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر یہ تطبیق کسی کے دل کو نہ لگے تو پھر ترجیح ہی کا راستہ اختیار کرنا ہو گا، اور ظاہر ہے کہ دو تین صحابیوں کے ان اقوال کے مقابلہ میں جن کے ثبوت میں بھی محدثین کو کلام ہے۔ صحیحین کی مندرجۂ بالا مرفوع حدیثوں پر ہی اعتماد کیا جائیگا۔

ناظرین کو یہاں اس چیز سے ذہول نہ ہو کہ حضرت عائشہ وابن عباس کے جن آثار کے متعلق یہ بحث ہے اُن میں اگرچہ موتی کی طرف سے نماز پڑھنے اور روزے رکھنے کی نفی کی گئی ہے لیکن اسی کے ساتھ ان کی طرف سے صدقہ کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے تو اصل بحث (یعنی مسئلہ ایصال ثواب) میں یہ آثار بھی ہمارے خلاف نہیں بلکہ موافق ہی ہیں۔ ہم عرض کر چکے ہیں کہ اس مقالہ میں ہمارے اصل مخاطب وہی حضرات ہیں جن کو مطلق ایصال ثواب سے انکار ہے۔ عبادات بدنیہ کے متعلق تو ہم خود ہی عرض

کرچکے ہیں کہ ان کے ذریعہ ایصال ثواب خود ائمہ سلف میں مختلف فیہ ہے۔

اموات کے لیے نماز اور اس کے ذریعہ ایصال ثواب

اموات مسلمین کے لیے نماز پڑھنے اور اس کے ذریعہ ان کو نفع و ثواب پہنچانے کے بارہ میں بھی متعدد صحابہ کرام کے آثار کتب احادیث میں مروی ہیں مثلاً

امام بخاری صحیح بخاری ہی میں حضرت ابن عمر و ابن عباس سے راوی ہیں:۔

وامر ابن عمر امرأة جعلت امها على نفسها صلوٰة بقباء فقال صلى عنها (باب من مات وعليه نذر) (صحیح بخاری)

کہ ایک عورت جس کی ماں نے مسجد قبا میں نماز پڑھنے کی نذر مانی تھی (اور اس کی ادائگی سے پہلے وہ مرگئی تو) عبداللہ ابن عمر نے اس کی اس بیٹی کے دریافت کرنے پر اس کو حکم دیا کہ ماں کی طرف سے وہ خود نماز پڑھے [1]

آگے امام بخاری فرماتے ہیں کہ "وقال ابن عباس نحوہ (اور عبداللہ ابن عباس نے بھی اس طرح فرمایا ہے)

اور سنن ابی داؤد میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے آپ نے ایک سلسلہ کلام میں فرمایا

من[2] يضمن لي منكم ان يصلي لي في مسجد العشار ركعتين او اربعاً ويقول هذه لابي هريرة" (باب فی ذکر البصرة کتاب الملاحم)

کون ہے جو میرے لیئے اس کا ذمہ لے کہ وہ مسجد عشار میں میرے واسطے دو یا چار رکعت نماز پڑھے اور کہے یہ ابوہریرہ کے لیے ہے۔

ان آثار سے ظاہر ہے کہ نماز کے ذریعہ اموات کی نفع رسانی اور ایصال ثواب کے

---

[1] حضرت ابن عباس اور ابن عمر سے اموات کی طرف سے روزے رکھنے اور نماز پڑھنے کی ممانعت بھی روایت کی گئی ہے (جس کا ذکر ابھی گزر چکا ہے) ہمارے نزدیک ان اقوال کے اس ظاہری تعارض کا حل یہی ہے کہ نیابۃً ادا کرنے سے ممانعت کی گئی ہے اور نماز روزے کے ذریعہ ایصال ثواب کی ہمت افزائی فرمائی گئی ہے۔ واللہ اعلم۔

[2] یہاں یہ ظاہر کردینا ضروری ہے کہ اس روایت کے دو راویوں (ابراہیم بن صالح اور ان کے والد صالح بن درہم) میں اکثر محدثین نے کلام کیا ہے۔ لیکن ابن حبان نے ان کو ثقات میں شمار کیا ہے۔

(بذل المجہود ص ۱۰۹/۵ج)

مسئلہ سے بھی صحابہ کرام پوری طرح آشنا تھے اور اس کو صحیح سمجھتے تھے۔

اور اصل تو یہ ہے کہ جب عبادات کے متعلق اصولی طور پر یہ ثابت ہو چکا کہ زندے اگر چاہیں تو اپنی عبادتوں کا ثواب اموات کو ہدیہ کر سکتے ہیں۔ تو پھر فقہی نظر میں ہر نوع کی عبادت کے لیے مستقل اور الگ الگ دلیل کی ضرورت نہیں

مبحث ششم

اموات کی طرف سے حج | خالص مالی اور خالص بدنی کے علاوہ عبادت کی جو ایک تیسری قسم ہے۔ جس میں روپیہ پیسہ بھی خرچ ہوتا ہے اور محنت مشقت بھی پڑتی ہے (جیسے کہ حج) تو اس کے ذریعہ اموات کی نفع رسانی اور ایصال ثواب کے متعلق بھی متعدد صریح احادیث کتب صحاح ہی میں مروی ہیں۔ از انجملہ ایک تو حضرت بریدہ کی وہی حدیث ہے جو صحیح مسلم کے حوالے سے ابھی ابھی نقل ہو چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک عورت نے چند مسئلے پوچھے جن میں آخری مسئلہ یہ تھا کہ میری والدہ بغیر حج کئے فوت ہو گئی ہیں، کیا میں ان کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ تو آپ نے فرمایا کہ ہاں! تم اُن کی طرف سے حج ادا کر دو! ۔ (صحیح مسلم باب قضاء الصوم عن المیت)

دوسری حدیث حج کے بارہ میں حضرت عبد اللہ بن عباس کی ہے جو صحیح بخاری میں بایں الفاظ مروی ہے۔

ان امرءۃ من جھینۃ جاءت الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقالت ان امی نذرت ان تحج فلم تحج حتی ماتت افاحج عنھا قال حجی عنھا ارأیت لو کان علی امک دین اکنت قاضیۃ اقضوا اللہ فاللہ احق بالوفاء

کہ قبیلہ جہینہ کی ایک عورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی کہ میری والدہ نے حج کی نذر کی تھی اور وہ اس کے پورا کرنے سے پہلے ہی وفات پا گئیں۔ تو کیا میں ان کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں ضرور تم اُن کی طرف سے حج ادا کرو پھر آپ نے فرمایا بتاؤ اگر تمہاری ماں پر

ؔ اس حدیث کی مختلف روایات میں کچھ معمولی سے اختلافات ہیں جن کی وجہ سے اس کے "اضطراب" کا شبہ ہو سکتا ہے

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

(صحیح بخاری باب الحج والنذر عن المیت)

کچھ قرض ہوتا تو تم اس کو ادا کرتیں یا نہیں۔ پس ایسے ہی اللہ کا جو حق ان پر تھا (یعنی حج)، اس کو بھی ادا کرو۔ اللہ پاک تو ادائیگی حقوق کا اور زیادہ مستحق ہے۔

اِن احادیث سے معلوم ہوا کہ اموات کی طرف سے حج بھی کیا جا سکتا ہے، اور آخری حدیث میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد نے کہ "جس طرح اموات کی طرف سے قرضے ادا کئے جا سکتے ہیں اور وہ ادا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اللہ کا قرض بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔" اس مسئلہ کو ایک اصولی حیثیت دیدی ہے۔

یہاں اس چیز کا واضح کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نماز اور روزہ وغیرہ خالص بدنی عبادات کے اموات کے لیے کرنے نہ کرنے اور اُن کے نافع ہونے یا نہ ہونے کے بارہ میں تو اگرچہ ائمہ سلف میں اختلاف ہوا ہے (جیسا کہ مذکور ہو چکا) لیکن حج کے بارہ میں صدقہ وخیرات ہی کی طرح اُن میں اس امر پر بالکل اتفاق ہے۔ کہ اموات کی طرف سے حج کیا جا سکتا ہے۔ اور اس سے اموات کو نفع اور ثواب پہونچتا ہے۔ اگرچہ پھر بعض نے اس کو مطلقاً تسلیم کیا ہے۔ اور بعض کے نزدیک یہ حکم کچھ قیود اور شرائط کیساتھ مقید اور مشروط ہے۔ جس کی تفصیلات "فتح الباری" وغیرہ شروح حدیث اور مبسوطات فقہ میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

واضح رہے کہ صحیح مسلم اور صحیح بخاری کی اِن دونوں حدیثوں (حدیث بریدہ وحدیث ابن عباس) کے علاوہ چند اور حدیثیں صحیحین اور سنن میں اس مضمون کی بھی موجود ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے معذور اور بے دست وپا بوڑھوں کے متعلق سوال کیا گیا جو سفر اور نقل وحرکت کے قابل نہ ہونے کی وجہ سے خود حج نہیں کر سکتے، کہ کیا اُن کی طرف سے کوئی دوسرا اُن کا آدمی حج ادا کر سکتا ہے؟ تو حضرت نے اس کی اجازت دی۔" اس قسم کے متعدد واقعات احادیث صحیحہ میں مروی ہیں۔ نیز احادیث سے اس کا بھی بین ثبوت ملتا ہے کہ عہد نبوی میں اس طرح دوسروں

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) حافظ ابن حجر نے مفصل کلام کر کے اس اختلاف کو حل کیا ہے (فتح الباری ص ۲۲ جز ۲)

کی طرف سے حج کیا گیا۔ حدیث کی متداول ہی کتابوں میں اس موضوع پر مستقل ابواب ہیں لیکن چونکہ اس مقالہ میں ہماری اصل بحث اموات کی طرف سے اعمال خیر کرنے اور ان کے لیے ان کے نافع ہونے ہی سے متعلق ہے اس لیے ان احادیث کو ہم نے یہاں درج نہیں کیا ہے، اگرچہ اتنی اصولی بات ان احادیث سے بھی ثابت ہوتی ہے کہ ایک مسلمان اپنے عمل خیر سے دوسرے مسلمان کو نفع اور ثواب پہنچا سکتا ہے، اور اسی اصل پر مسئلہ "ایصال ثواب" کی بنیاد ہے۔

اسی مسئلہ کے متعلق ایک اور علمی بحث بھی یہاں قابل ذکر ہے جس سے اس مسئلہ کے سلجھاؤ میں ناظرین کرام کو مدد مل سکتی ہے اور وہ یہ ہے:-

نیابت کی صحت کے لحاظ سے عبادات کی تقسیم

دوسروں کی طرف سے اعمال خیر کرنے کے بارہ میں جو مختلف احادیث وارد ہوئی ہیں ان میں غور و فکر کر کے اکثر مجتہدین اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ "عبادات" دو قسم کی ہیں، ایک وہ جن میں نیابت کی گنجائش ہے۔ یعنی جن کا حال یہ ہے کہ اگر ان کو مکلف کی طرف سے کوئی دوسرا، نیابۃً ادا کردے تو وہ ادا ہو جاتے ہیں جیسے کہ بندوں کے آپس کے مالی حقوق قرضہ جات وغیرہ کا حال ہے۔ (مثلاً زید کو عمرو کے ہزار روپئے دینے ہیں تو اب اگر زید کی طرف سے، مثلاً اس کا بھائی بکر، یہ ایک ہزار روپے عمرو کو ادا کردے تو زید کے اوپر سے اُتر جاتے ہیں، پھر خواہ بکر کی طرف سے یہ ادائیگی زید کی زندگی میں ہوئی یا زید کے مرنے کے بعد، بہرحال قرضہ زید کی طرف سے ادا ہو جاتا ہے) تو یہی حال اللہ پاک کے بعض حقوق بندگی (یعنی بعض عبادات) کا ہے کہ بطور نیابت اگر ان کو مکلف کی طرف سے کوئی دوسرا شخص (بالخصوص معذوری کی حالت میں) ادا کردے تو مکلف ہی کی طرف سے اس کی ادائیگی ہو جاتی ہے۔ یعنی پھر مکلف کے ذمہ سے وہ حق اتر جاتا ہے۔

اور دوسری قسم کی عبادات وہ جن میں اس طرح کی نیابت نہیں چل سکتی۔

پھر جن مجتہدین نے کل عبادات کی یہ دو قسمیں سمجھی ہیں (اور انہیں میں سے فقہائے حنفیہ بھی ہیں) قریباً وہ سب اس پر متفق ہیں کہ خالص بدنی عبادات مثلاً روزہ۔ نماز وغیرہ میں نیابت نہیں چل سکتی۔

لیکن خالص مالی عبادات، مثلاً صدقہ و خیرات اور قربانی وغیرہ میں، نیز اون عبادات میں بھی جو مالی اور بدنی دونوں قسم کی قربانیوں پر مشتمل ہوں. جیسے کہ حج تو ان سب میں اپنے شرائط کے ساتھ نیابت صحیح ہے یعنی خاص حالات میں، دوسروں کے ادا کر دینے سے بھی مکلف کے سر سے ان کا بوجھ اتر جائیگا اور فرض ادا ہو جائیگا۔ جیسا کہ قرضہ وغیرہ آپس کے مالی حقوق کا حال ہے۔

پھر یہ تفریق صرف "نیابت" میں ہے ایصال ثواب اس کے علاوہ چیز ہے۔

"ایصال ثواب" میں خود اس مردے کے فرض کی ادائیگی اور اس کی طرف سے نیابۃً اُس عمل کا کرنا مقصود نہیں ہوتا ہے، بلکہ اپنے کیے ہوئے عمل کا صرف اُس کو ثواب پہنچانا پیش نظر ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بالکل دوسری چیز ہے اور یہ تو دعائے خیر اور دعائے رحمت کی طرح کا صرف ایک حسن سلوک اور میت کے ساتھ احسان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے وہ فقہا جو بدنی عبادات نماز روزہ وغیرہ میں نیابت کے قائل نہیں ہیں۔ مثلاً فقہا حنفیہ وہ انہی عبادات کے ذریعہ "ایصال ثواب" کے قائل ہیں۔

نتیجہ بحث خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جو صرف مسئلہ کو سلجھانے کے لیے یہاں ذکر دیا گیا اب اصل مسئلہ کے متعلق مذکورۃ الصدر دلائل کو سامنے رکھنے کے بعد بطور حاصل مدعا کے دو باتیں عرض کرنی ہیں:

(الف) اتنی بات تو دعا و استغفار کے متعلق وارد شدہ قرآن پاک کی واضح آیات سے ثابت ہو کہ اموات کو زندوں کے دعا و استغفار سے فائدہ پہونچتا ہے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ یہ دعا اور یہ استغفار ان مردوں کا اپنا عمل نہیں ہے۔ بلکہ اُن کی نفع رسانی کے لئے زندوں ہی کا عمل ہے۔ اس سے منکرین کی یہ بنیاد تو بالکل ڈھے جاتی ہے کہ کسی آدمی کو کسی دوسرے آدمی کی کسی سعی اور کسی عمل سے کوئی نفع نہیں پہونچ سکتا۔" غرض اس سالبہ کلیہ کو تو جس کو یہ منکرین اپنی خوش فہمی سے قرآن کی طرف منسوب کرتے ہیں، خود قرآن مجید کی آیاتِ بینات نے توڑ دیا۔

(ب) "بحث دوم" سے لیکر یہاں تک، عبادات مالیہ، عبادات بدنیہ اور مرکبہ کے متعلق جتنی احادیث پیش کی گئی ہیں وہ سب اگرچہ بجائے خود بہ اصطلاح محدثین" اخبار آحاد" ہیں؛ اور اگرچہ ان کے مضامین اور متضمنات الگ الگ ہیں، لیکن بطور "قدر مشترک" کے اتنی بات اون سب سے معلوم ہوتی ہے

کہ "زندہ مسلمان اپنے اعمال خیر کے ذریعہ مردہ مسلمانوں کو نفع اور ثواب پہنچا سکتے ہیں اور یہ نفع اور ثواب مردوں کو پہنچنا برحق ہے" تو اس مسئلہ کی بنیاد صرف "خبر واحد" کے درجہ کی ظنی حدیثوں پر نہیں رہی بلکہ "قدر مشترک والے تواتر" سے اس کا ثبوت ہوا۔ اور اہل علم جانتے ہیں کہ "تواتر قدر مشترک" بھی "تواتر اسنادی" ہی کی طرح موجب علم یقین ہوتا ہے[1]۔

نیز اس مسئلہ کو تواتر عملی بھی حاصل ہے یعنی ہر زمانہ میں مسلمانوں کا اس پر عمل رہا، یہی وجہ ہے کہ تفصیلات اور جزئیات میں اختلافات کے باوجود نفس اصولی مسئلہ میں گویا جمہور اہل اسلام اور تمام ائمہ سلف کا اجماع اور اتفاق ہے جیسا کہ مختلف مکاتب خیال کے علماء متقدمین و متاخرین کی کتابیں شاہد ہیں، اور سب سے بڑی شہادت دوسری صدی ہجری کے جلیل القدر امام حضرت عبداللہ بن المبارک کی ہے جو "صحیح مسلم" کے حوالہ سے مقالہ ہذا کے صفحہ ۱۹ پر درج ہو چکی ہے۔

پس کتاب و سنت کے ان واضح دلائل، صحابہ کے آثار، ائمہ سلف کے اجماع و اتفاق اور پوری اسلامی تاریخ کے عملی تواتر کے ہوتے ہوئے یہ دعویٰ کرنا کہ "زندوں کے کسی سعی و عمل سے مردوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا" ایک حیرت انگیز جسارت ہے۔ واضح رہے کہ ہمارا زور اور ہمارا اصرار بھی صرف اتنے ہی اصول پر ہے جس کو تواتر اور اجماع کی قوت حاصل ہے، باقی جن تفصیلات و جزئیات میں اس کے بھی اختلاف ہوا ہے ان کے کسی پہلو پر خود ہم کو بھی اصرار نہیں ہے۔

یہاں تک ہمارا کلام نفس مسئلہ کے ثبوت پر تھا، اب ہم حضرات منکرین کے ان "دلائل" کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو اس بارہ میں ان کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں

[1] "تواتر قدر مشترک" "تواتر" کی چار قسموں میں سے ایک ہے اور اس کی حقیقت جو علماء اصول نے بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ مختلف واقعات کو مختلف اشخاص مثلاً نقل کریں لیکن ان واقعات اور ان مختلف خبروں میں کوئی امر کلی مشترک ہو یعنی وہ بات ان تمام مختلف واقعوں اور خبروں سے یکساں طور پر مفہوم ہوتی ہو تو اگرچہ ان واقعات اور ان خبروں کی تفصیلات پر ہمیں یقین نہ ہو، لیکن اس "امر کلی مشترک" کا ہم کو بالکل یقین ہو جاتا ہے اس کی مثال ہماری روایتی معلومات میں یہ ہے کہ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فقر پسندی اور سادہ زندگی، حضرت ابوبکر و عمر کی دور خلافت میں بھی درویشانہ زندگی۔ اور حضرت خالد کی جنگی مہارت یہ سب چیزیں جن مختلف منقولہ واقعات سے سمجھی جاتی ہیں وہ سب بجائے خود "اخبار آحاد" ہی ہیں اور اسی لیے ان میں سے ہر واقعہ بجائے خود صرف ظنی ہی ہے لیکن ان واقعات سے بطور قدر مشترک جو یہ نتیجے نکلتے ہیں یہ اہل علم کے نزدیک بلاشبہ یقینی ہیں۔ یہ یقین جس چیز نے پیدا کیا بس اسی کا نام "تواتر قدر مشترک" ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "مقدمہ فتح الملہم صفحہ ۱۲"

مبحث ہفتم

منکرین کے دلائل یا شبہات!

ابتدائی تمہیدی سطروں میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اس مسئلہ میں منکرین کو چند آیات سے بھی مغالطہ لگا ہے اور اس لئے وہ اپنی غلط فہمی سے اس انکار کو قرآن پاک کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اِن آیات پر ہم کو تفصیل سے کلام کرنا ہے۔ لیکن اس سے پہلے اُن کے ایک دو اصولی شبہوں کا جواب دیدینا مناسب معلوم ہوتا ہے جن کو وہ خود بھی پہلے نمبر پر پیش کیا کرتے ہیں۔

پہلا شبہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں کہیں ایصال ثواب کی تعلیم نہیں دی گئی۔" اور جس چیز کے متعلق قرآن خموش ہے اور اُس کا تعلق عقائد یا عبادات سے کہا جاتا ہے تو پھر وہ چیز دین میں کان لم یکن شیئاً مذکوراً کا حکم رکھتی ہے اور بالکل بے اصل چیز ہے[له]

حیرت ہے کہ اتنا بڑا اور اتنا اہم دعویٰ کتنی سادگی اور بے پروائی سے کردیا گیا ہے خیال ایسا ہوتا ہے کہ شاید اس عبارت کے حوالہ قلم کرتے وقت صاحب مضمون سے الفاظ کے انتخاب میں غیر ارادی طور پر چوک ہوگئی ہے۔ ورنہ غالباً اون کا مقصد اتنا عام دعویٰ کرنا نہ ہوگا۔ جس سے دین کی ساری عمارت ہی درہم برہم ہو جاتی ہے۔

اور چیزوں کو جانے دیجیے صرف نماز ہی کو لے لیجیے جو دین کا رکن رکین اور افضل عبادات ہے۔ سب جانتے ہیں کہ قرآن میں تو صراحتہً یا اشارۃً یہ بھی مذکور نہیں ہے کہ فجر میں اتنی رکعات پڑھی جائیں، ظہر میں اتنی، عصر میں اتنی اور مغرب و عشا میں اتنی اتنی، نیز قرآن اس سے بھی خاموش ہے کہ ایک ایک وقت کی نمازیں کتنے رکوع ہوں، کتنے سجدے، کتنے قعدے اور پھر کہاں کہاں کیا کیا پڑھا جائے؟ اور ظاہر ہے کہ اِن سب سوالات کا تعلق اعلیٰ درجہ

له انکار ایصال ثواب پر رجب و شعبان سنہ ۶۳ھ کے "الفرقان" میں صوبہ بہار کے ایک صاحب کا مضمون شائع ہوا تھا یہ اوسی کا اقتباس ہے ۱۲۔

کی عبادت، نماز ہی سے ہے اور قرآن ان تمام امور سے خاموش ہے! (یہاں احادیث اور اسوۂ رسول سے یہ سب چیزیں معلوم ہوتی ہیں، اور اسی پر ساری امت کے عمل کی بنیاد ہے) تو اگر نئی روشنی کے اجتہاد کے اس دعویٰ کو تسلیم کر لیا جائے گا۔

جس چیز کے متعلق قرآن خموش ہے اور اس کا تعلق عقائد یا عبادات سے ہے تو پھر وہ چیز دین میں "کان لم یکن شیئاً مذکوراً - اور بالکل بے اصل ہے"

تو نماز تک کی کوئی متعین شکل نہیں ہو سکتی ہے والعیاذ باللہ تعالیٰ۔

جیسا کہ عرض کیا گیا بہت ممکن ہے کہ جن صاحب نے مسئلہ ایصال ثواب پر کلام کرتے ہوئے یہ الفاظ لکھے ہیں اُن کی مراد اتنی عام نہو۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہ گمراہی سخت جاہلانہ ہونے کے باوجود آج کل عام ہے، اور کتنے ہی بی۔ اے، ایم، اے پاس قسم کے نئی روشنی کے مجتہدین ہیں جو اس قسم کے مضامین پڑھ پڑھ کر ہی دین کیساتھ تلاعب کرتے رہتے ہیں۔ اگر اس قسم کی علمی بدتمیزی کی عبرتناک مثال دیکھنی ہو تو پنجاب کے ایک منکر حدیث صاحب کا صرف ایک رسالہ صلوٰۃ المرسلین دیکھنا کافی ہوگا جو کئی سال ہوئے اون صاحب نے "نظامی پریس بدایوں میں" چھپوا کر شائع کیا تھا۔ جس میں مسلمانوں کی نماز کو غیر قرآنی بلکہ قطعاً خلاف قرآن ثابت کرنے کے بعد اپنی طرف سے نماز کا ایک نیا طریقہ اس دعوے کے ساتھ پیش کیا تھا کہ یہی قرآنی نماز ہے اور انبیاء و مرسلین بس ایسی ہی نماز پڑھا کرتے تھے

بہرحال اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ عقائد و عبادات کے متعلق جو چیز قرآن میں مذکور نہ ہو وہ دین میں بے اصل ہے) تو سارا دین ایک متعین دستور حیات ہونے کے بجائے آوارگان عصر کی آرزوؤں کے مطابق محض ایک مبہم فلسفہ ہو کر رہ جائیگا جس کی نہ نماز متعین ہوگی نہ روزہ نہ کچھ اور، اور مجھے معلوم ہے کہ جن صاحب کی عبارت اوپر منقول ہوئی ہے وہ خود اس خیال کے نہیں ہیں۔ بلکہ نماز وغیرہ کے جو ارکان اور جو تفصیلات صاحب نبوت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ثابت ہیں وہ اُن سب کو واجب الاتباع جانتے ہیں۔ پس اون سے عرض کرنا یہ ہے کہ جب نماز کے ارکان اور اس کے متعلق دیگر ضروری چیزوں سے قرآن مجید کے خموش ہونے کے باوجود ارشادات نبوی اور اسوۂ نبوی سے ہم یہ چیزیں لیتے ہیں اور اُن کو حجۃ دین سمجھتے ہوئے واجب العمل جانتے ہیں تو

پھر اسی سرچشمہ سے اگر "ایصال ثواب" جیسے مسائل معلوم ہوں (حالانکہ ان کی اہمیت کو نماز اور اس کے متعلقات کی اہمیت سے کوئی نسبت نہیں ہے) تو پھر وہ کیوں قابلِ اتباع نہ ہوں گے

علیٰ ہذا یہ حضرات اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ بہت سی حرام غذاؤں کی حرمت کے بیان سے قرآن خاموش ہے۔ (حتیٰ کہ کتے کی حرمت بھی قرآن شریف میں کہیں صاف بیان نہیں کی گئی ہے) اور یہ سب چیزیں صاحب نبوت ہی کے ارشادات اور آپ کے اسوہ ہی سے معلوم ہوتی ہیں، اور اس بارہ میں جو کچھ آپ سے ثابت ہو جائے وہ سب واجب الاتباع ہے، تو "ایصال ثواب" جیسے مسائل میں قرآن مجید اگر خاموش ہو، لیکن سنت نبوی ناطق ہو تو کیوں وہ احکام نبوی واجب الاتباع نہ ہوں گے۔ اگر صحیح غور و فکر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں کوئی اور درمیانی راہ نہیں ہے۔ صرف دو ہی راہیں ہیں ایک یہ کہ "ما جاء من عند اللہ" یعنی وحی الٰہی کو صرف قرآن میں منحصر مانا جائے اور صاف کہہ دیا جائے کہ جو چیز قرآن میں نہیں ہے وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ اس اصول پر تو ہر اُس چیز کے امر دینی ہونے سے انکار ہی کرنا صحیح ہوگا جو قرآن میں بیان نہ کی گئی ہو خواہ وہ کسی باب کی ہو؛

اور دوسری راہ یہ ہے کہ "ما جاء من عند اللہ" کو قرآن میں منحصر نہ سمجھا جائے بلکہ مانا جائے کہ اللہ کے رسول پر قرآن کے علاوہ بھی وحی ہوتی تھی اور اس لیے دین کے کسی شعبہ میں بھی اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حکم اور کوئی بات قابلِ وثوق طریقہ سے ثابت ہو جائے تو اس کو واجب الاتباع مان کر اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا جائے خواہ وہ عقائد سے متعلق ہو یا عبادات سے، معاملات سے متعلق ہو یا حلال و حرام سے۔ قرآن اُس سے خاموش ہو یا اُس کے بارہ میں ناطق

بہرحال یہ مان لینے کے بعد کہ دین کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف اوامر الٰہیہ کے ترجمان تھے اور قرآن مجید کے علاوہ بھی آپ پر وحی ہوتی تھی (جس کو وحی غیر متلو کہتے ہیں اور اسی وحی سے نماز وغیرہ کی تفصیلات متعین ہوئی ہیں)، اس قسم کے نظریات کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ:۔

"قرآن جن چیزوں سے خموش ہو اور ان کا تعلق عقائد یا عبادات سے ہو تو وہ دین میں سرے سے بے اصل اور کان لم یکن شیئاً مذکوراً ہیں"

پس اگر "ایصال ثواب" کی تعلیم سے قرآن مجید خموش بھی ہے لیکن، سنت نبوی سے صرف صحیح اسانید ہی کے ساتھ نہیں، بلکہ یہ "تواتر قدر مشترک" وہ ثابت ہے پھر اُمت کے عملی تواتر اور ائمہ دین کے تمام طبقات فقہاء و مجتہدین محدثین اور مفسرین کے اجماع و اتفاق نے اس کے ثبوت کو اور بھی زیادہ قطعی اور یقینی کر دیا ہے۔ تو یقیناً وہ حق ہے۔ وما ذا بعد الحق الا الضلال۔

دوسرا شبہ دوسرا شبہ اسی قسم کا یہ کیا جاتا ہے کہ اگر "ایصال ثواب" کا نظریہ صحیح ہوتا تو عہد نبوی اور عہد صحابہ میں اس پر عام طور سے عمل کیا جاتا۔ حالانکہ یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اُس زمانہ میں ایصال ثواب کا معمول ہو اور لوگ عام طور سے ایسا کرتے ہوں۔

اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں اموات کی طرف سے اور ان کی نفع رسانی کے لیے، صدقہ و خیرات کرنے، قربانی کرنے، غلام آزاد کرنے، حتیٰ کہ روزہ نماز اور حج کرنے کے متعدد واقعات ہماری پیش کردہ روایات سے معلوم ہو چکے ہیں اور نفس مسئلہ کے ثبوت کے لئے اتنا ہی کافی بلکہ کافی سے زائد ہے۔

علاوہ ازیں صحابہ کرام سے اس قسم کی کسی چیز کا عام طور سے منقول نہ ہونا اس بات کی ہرگز دلیل نہیں بن سکتا کہ وہ کبھی اس کو کرتے ہی نہ تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ جن امور میں اعلان و اظہار اور تداعی مطلوب ہو، جیسے کہ مثلاً فرض نمازوں کا جماعت سے مسجدوں میں پڑھنا، رمضان کے روزے رکھنا، حج کرنا، قربانی کرنا وغیرہ وغیرہ۔ سو یہ سارے کام چونکہ علی الاعلان کرنے کے ہیں۔ اس لیے ایک دوسرے کو ان کا علم ہونا اور پھر نقل کیا جانا قرین قیاس ہے۔ لیکن جن کاموں کی حیثیت یہ نہیں ہے۔ مثلاً غریب پڑوسیوں اور غریب عزیزوں قریبوں کے ساتھ کچھ سلوک کرنا، یتیموں بیواؤں کی خبر لینا وغیرہ وغیرہ جن میں اخفا ہی بہتر ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ ان کاموں کا اظہار و اشتہار چونکہ مناسب نہیں، اس لیے دوسروں کے علم میں وہ بہت کم آسکینگے اور اس واسطے ان کی نقل و روایت بھی نہ ہو سکے گی۔ صحابہ کرام کا عام طریقہ یہ تھا کہ اس قسم کے کاموں میں وہ اخفا کو پسند فرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اجتماعی قسم کے دینی کاموں کے علاوہ اس قسم کی انفرادی نیکیاں ان سے بہت زیادہ منقول نہیں ہیں

اور ظاہر ہے کہ "ایصال ثواب" بھی ایسی ہی چیز ہے کہ اس کا اعلان و اظہار مناسب نہیں، بہر اللہ کے زندہ بندہ کی طرف سے کسی مردہ بندہ کے ساتھ حسن سلوک ہی تو ہے اور وہ بھی ایسا کہ نہ اس کو اللہ نے فرض کیا ہے نہ واجب۔ بہر حال یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام سے اس کے کرنے کا ثبوت بہت زیادہ نہیں ملتا اور یہ "ایصال ثواب" ہی کی خصوصیت نہیں ہے۔ اموات مومنین و مومنات کے لیے دعا و استغفار جو نص قرآن سے ثابت ہے بالخصوص والدین کے لیے دعائے رحمت و مغفرت کا حال بھی یہی ہے کہ صحابۂ کرام سے اس کا بطریق عموم معمول ہونا روایات سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس میں شک ہو تو کیا ہمارے "مخاطبین" کتب احادیث و آثار سے عام صحابہ کے متعلق دکھلا سکتے ہیں کہ وہ اپنے والدین اور عام مومنین و مومنات کے لیے اس طرح مغفرت و رحمت کی دعائیں اللہ سے کیا کرتے تھے؟ قریباً ایک لاکھ صحابیوں میں سے صرف ایک سو صحابیوں ہی سے اس کا ثبوت پیش کر دیا جائے — یقیناً روایات سے اس کا ثبوت نہیں دیا جا سکتا تو کیا اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہوگا کہ قرآن میں صریح حکم ہونے کے باوجود عام صحابہ اس پر عمل نہیں کیا کرتے تھے؟

بہر حال اصل حقیقت یہی ہے کہ جس چیز کو اللہ نے فرض و واجب نہیں کیا اور جس عمل میں بجائے اعلان و اظہار کے اخفاء اولیٰ و احسن ہو، اس کے متعلق قرین قیاس یہی ہے کہ اس کا علمی ثبوت کم ملے، پس ہمارے ذخیرہ حدیث و روایت میں "ایصال ثواب" کے واقعات اگر کم ملتے ہیں تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا اور یہ ثابت کرنا کہ صحابہ کرام میں "ایصال ثواب" رائج ہی نہ تھا بہت ہی ادنیٰ درجہ کی علمی غلطی ہے۔ ہاں! حقیقت دین سے ناواقف طبقوں میں آج کل جس طرح اعلان اور تداعی کے ساتھ اجتماعی طور سے "ایصال ثواب" کے نام سے بہت سی رسمیں ادا کی جاتی ہیں اور اُس کو جو غیر معمولی اہمیت دے دی گئی ہے کہ اپنے فرائض نماز روزہ وغیرہ کا بھی اتنا اہتمام نہیں جتنا کہ "ایصال ثواب" کی ان رسموں کی ادائیگی کا، تو اس کے متعلق یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ اگر عہد صحابہ و تابعین میں ایسا ہوتا تو ضرور منقول ہوتا کیونکہ اعلان و تداعی کے ساتھ اجتماعی طور پر جو کام کئے جائیں اون کا منقول ہو کر ہم تک پہنچنا عقلاً و عادۃً ضروری ہے لیکن ہماری بحث صرف اصولی مسئلہ میں ہے، مروجہ تیجہ۔ دسواں وغیرہ جیسی لغو اور جاہلانہ

رسموں کے غلط بلکہ بدعت و معصیت ہونے میں کون صاحب علم شک کر سکتا ہے۔

الحاصل، عہد نبوی اور قرن صحابہ میں "ایصال ثواب" کے عملی واقعات کا ثبوت جو کم ملتا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ صحابہ کرام "ایصال ثواب" اور اموات کی نفع رسانی کے لیے کوئی عمل کیا ہی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ کام چونکہ اُن نیکیوں میں سے ہے جن کو چھپا کے کرنا چاہیئے اور اعلان و اظہار اس کے لیے مناسب نہیں ہے۔ اس لیے صحابہ کرام نے اس کو اعلان و اظہار کے ساتھ نہیں کیا اور اس لیے اس کے واقعات ہم تک کم پہنچے، بلکہ غور کرنے کی بات ہے کہ یہ جو چند متفرق واقعات احادیث سے معلوم بھی ہوتے ہیں، وہ بھی اس وجہ سے نقل و روایت میں آگئے ہیں کہ کسی صحابی نے مثلاً آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو حضرت نے جواب دیا؛ یا اسی طرح کسی صحابی سے سوال کیا گیا اور اونھوں نے جواب دی دیا، یا کوئی اور ایسا ہی محرک پیش آگیا تو اظہار کر دیا گیا۔

بہر حال جو واقعات اور جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اس سلسلہ میں کتب احادیث میں درج ہو گئے ہیں وہ بھی سوالات کی کھود کرید یا کسی اور محرک کی وجہ سے ظاہر ہو گئے ہیں، ورنہ شاید ان پر بھی پردہ پڑا رہتا، مثلاً حضرت سعد کا اپنی والدہ کی طرف سے کنواں اور باغ وقف کرنا یا بعض اور صحابہ کا حضرت سے صدقہ عن المیت، اور حج عن المیت وغیرہ کے متعلق سوال کرنا اور اس پر عمل کرنا یا حضرت علی کو دو قربانی کرتا دیکھکر کسی شخص کا اون سے دریافت کرنا کہ یہ دو قربانی آپ کس لئے کرتے ہیں؟ اور حضرت علی کا بتلانا کہ دوسری قربانی میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کرتا ہوں تو ظاہر ہے کہ یہ ساری چیزیں سوال کرنے والوں کی کھود کرید نے ظاہر کی ہیں۔ الغرض صحابہ کے حال سے یہ بہت ہی مستبعد ہے کہ وہ اموات کے لئے کوئی نیک کام کریں اور دوسروں کو جتلائیں کہ یہ ہم فلاں کو ثواب پہونچانے کے لیے کر رہے ہیں۔ بہر حال ایصال ثواب کے عملی واقعات کے زیادہ منقول نہ ہونے کی اصل وجہ یہی ہے، نہ یہ کہ اس باب میں وہ کچھ کرتے ہی نہ تھے۔ واللہ اعلم۔

آیات قرآنی سے مغالطہ | آخر میں ہم اون آیات کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں جن کو پڑھ پڑھ کر

یہ حضرات منکرین دوسروں کو مغالطے دیا کرتے ہیں یا وہ خود ہی اون کے بارہ میں مغالطے میں ہیں

اس سلسلے میں سب سے پہلی آیت جس کو یہ حضرات اپنی خوش فہمی سے نظریہ "ایصال ثواب" کے خلاف گویا نص قطعی سمجھتے ہیں سورہ والنجم کی یہ مشہور آیت ہے۔

لیس للانسان الا ما سعیٰ — انسان کے لئے بس وہی ہے جو اس نے سعی کی اور کمایا۔

لیکن اگر سلامت فہم کے ساتھ معمولی غور و فکر سے کام لیا جائے تو یہ غلط فہمی دور ہو سکتی ہے یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس آیت میں "انسان" پر جو "ل" ہے یہ آیا ملکیت کے لیئے ہے یا انتفاع کے لیئے؟ پہلی صورت میں آیت کا مطلب اور مفاد یہ ہوگا کہ "انسان صرف اپنی ہی سعی و محنت اور اپنی ہی کمائی کا مالک ہے۔ دوسروں کی محنت اور کمائی کا وہ مالک نہیں"۔ اور اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ بلکہ نظریہ ایصال ثواب" کی بنیاد ہی اس پر ہے کہ انسان چونکہ اپنی سعی و عمل کا مالک و مختار ہے اس لیئے اس کو حق ہے کہ وہ اپنی چیز دوسرے کو ہدیہ کر دے۔ بہر حال اس آیت میں "ل" اگر ملکیت کا مانا جائے تو مسئلہ ایصال ثواب کے لیئے یہ آیت مخالف تو کیا ہوتی کچھ مؤید اور موافق ہی ہوگی۔ اور اہل علم کو معلوم ہے کہ "ل" کا استعمال زیادہ تر ملکیت ہی کے لیئے ہوتا ہے اور قرآن مجید میں اس کا بیشتر استعمال اسی معنی میں ہوا ہے۔

اور اگر دوسری صورت اختیار کی جائے یعنی "ل" کو انتفاع کے لیئے لیا جائے تو آیت کا مطلب اور مفاد یہ ہوگا کہ:۔

"انسان کو اپنی ہی سعی و محنت سے نفع ہوتا ہے اور اس کی اپنی ہی کمائی اس کے کام آتی ہے"۔

پھر اس صورت میں یہ ماننا پڑیگا کہ یہ حصر محض اضافی اور عرفی ہے۔ منطقی قسم کا حصر کلی نہیں ہے اور آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان کو اپنے ذاتی عمل کے سوا کسی دوسری چیز سے مطلقاً کوئی نفع ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ یہ بات از روئے قرآن اور از روئے مشاہدہ دنیا کے لحاظ سے بھی غلط ہے اور آخرت کے لحاظ سے بھی، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص محنت کر کے کماتا ہے اور بہت سوں کو کھلاتا ہے، صدقہ و خیرات کرتا ہے۔ ہدیئے دیتا ہے۔ خود قرآن مجید بھی کمائی

کرنے والوں اور دولت پیدا کرنے والوں کو جا بجا حکم دیتا ہے کہ وہ اوس سے دوسری حاجتمندوں اور فقرا و مساکین کو نفع پہونچائیں۔ علیٰ ہذا قرآن بتلاتا ہے کہ ایک شخص مرجائے تو اُس کے کمائے ہوئے مال و دولت میں سے اتنا ماں کو، اتنا باپ کو، اتنا اتنا بیٹوں اور بیٹیوں کو ملیگا۔ اہل علم جانتے ہیں کہ احکام قرآنی سے اور بھی اس کی دسیوں بیسیوں نظیریں نکالی جاسکتی ہیں کہ اس دنیا میں ایک کی سعی و محنت سے دوسرے کو فائدہ پہونچتا ہے۔ علیٰ ہذا آخرت کے متعلق بھی قرآن پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے نیک اعمال کے علاوہ اللہ پاک کی خاص رحمت اور اس کے فضل و کرم سے بھی بہت سوں کو بہت کچھ ملے گا۔ نیز بہ اذن خداوندی شفاعت کا نافع ہونا بھی قرآن مجید ہی سے ثابت ہے، علیٰ ہذا انبیاءؑ و صالحین اور ملائکہ مقربین کا اہل ایمان کے لیئے مغفرت و رحمت کی دعائیں کرنا بلکہ خود اللہ پاک کا اس دعا و استغفار کے لئے حکم دینا بھی قرآن پاک ہی سے ثابت ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ دعائیں محض لغو اور بیکار نہ جائیں گی۔ بلکہ اللہ پاک کے یہاں قبول ہو کر اُن اہل ایمان کی مغفرت و رحمت اور رفعتِ درجات کا ذریعہ بنیگی اور یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ اللہ پاک کا یہ رحم و کرم فرمانا اور اعمال کی نپی تلی اصلی جزا کے علاوہ محض اپنے فضل سے کچھ اور انعامات سے نوازنا بندہ کی اپنی سعی اور اپنی کمائی نہیں ہے بلکہ اللہ پاک کا فعل ہے۔ اسی طرح آخرت میں مقربین کی شفاعت، اور اس دنیا میں زندوں کا دعا و استغفار کرنا یہ بھی دوسروں ہی کا فعل ہے، اور ان سب سے نفع پہنچنا نصوص قرآن سے ثابت، پس یہ کلیہ کہ کبھی انسان کو اپنی سعی و محنت کے علاوہ کسی دوسری چیز سے کوئی نفع نہیں پہنچیگا دنیا کے لحاظ سے بھی، اور آخرت کے حق میں بھی از روئے قرآن غلط ثابت ہوا۔

لہذا "ل" کو اگر انتفاع کے لیئے مانا جائے تو لامحالہ ماننا پڑے گا کہ آیت میں جو حصر کیا گیا یہ منطقی قسم کا حصر کلی نہیں ہے، بلکہ یہ حصر اضافی اور عرفی ہے، یعنی آیت کا مقصد انسان کی اپنی سعی کے علاوہ جمیع ماسوئی کی نافعیت کی نفی کرنا نہیں ہے بلکہ خاص طور سے اُن چند غلط فہمیوں کو دفع کرنا مقصود ہے جن میں بہت سی قومیں اور بہت سے گروہ اُس وقت مبتلا تھے اور اب تک مبتلا ہیں۔ مثلاً بنو اسرائیل سمجھتے تھے کہ ہم چونکہ نبیوں کی اولاد ہیں اس لیے ہم جنت میں جائیں گے یا مثلاً مشرکین عرب کا خیال تھا کہ ہمارے دیوتاؤں کا جو اللہ سے خاص تعلق ہے بس یہہ

ہماری نجات کا ذریعہ ہو جائے گا۔ اور اسی طرح عیسائی سمجھتے تھے کہ یسوع مسیح سولی پر چڑھ کر ہم سب کی طرف سے کفارہ ادا کر چکے ہیں اس لیئے ان کی یہ قربانی ہماری نجات کے لئے کافی ہے ہندوستان میں بھی برہمن پنڈت آج تک اسی قسم کی توہمات میں بتلا ہیں تو "ل" کو انتفاع" کے لئے ماننے کی صورت میں آیت کو حصر عرفی پر محمول کر کے ماننا پڑیگا کہ۔ آیت کا منشا بس اس قسم کے توہمات اور بے اصل خیالات کی نفی کرنا ہے اور مطلب صرف یہ ہے کہ آدمی اس قسم کی غلط فہمیوں اور جھوٹی امیدوں میں مبتلا نہ رہے کہ میرے باپ دادا یا میرے بزرگ اور پیشوا چونکہ نیک اور خدا کے منوب بندے تھے اس لیئے ان کے تعلق اور ان کی برکت کی وجہ سے میں بھی بخشا جاؤنگا اور ان کے نیک اعمال مجھے بھی جنت میں لے جائیں گے"۔ جس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی سیدہ فاطمہ زہرا اور اپنے دوسرے اقارب سے فرمایا تھا کہ عمل کرو! عمل!! اس گھمنڈ میں نہ رہو کہ میرا خونی رشتہ اور میرا قرابتی و خاندانی تعلق تمھیں نجات دلائے گا"۔

الغرض حصر عرفی کی اس تقدیر پر آیت کا مدعا صرف مذکورہ بالا قسم کی گمراہانہ اور بے اصل اوہام کی تردید کرنا ہی ہوگا لہذا اللہ کی کریمانہ رحمت و مغفرت۔ مقربین کی شفاعت۔ انبیاءؑ ملئکہ، مومنین کی دعا و استغفار اور علی ہذا ایصال ثواب کی صحیح صورتوں کی نافعیت سے اثباتاً یا نفیاً اس آیت کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔

اور اس طرح کا حصر اضافی و عرفی ہر زبان کے محاورات کلام میں اور خصوصاً قرآن مجید میں بکثرت مستعمل ہے، بلکہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ حصر زیادہ تر اضافی و عرفی ہی استعمال ہوتا ہے۔ ہم صبح سے شام تک بارہا بولتے ہیں:۔ "میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا"۔ "میں اس کے سوا کچھ نہیں کہتا" "میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا"۔ "میرے پاس اس چیز کے سوا کچھ نہیں ہے"۔ "میرے پاس سوائے فلاں شخص کے کوئی نہیں آیا۔ اس قسم کی صدہا مثالیں ہیں جو ہماری زبانوں پر روزمرہ آتی رہتی ہیں اور مراد حصر عرفی ہی ہوتا ہے، اور اگر کوئی بدذوق شخص گفتگو کے وقت اس قسم کے جملوں سے حصر منطقی مراد لے کر بحث کرنے لگے تو اُس کو جاہل اور نا قابلِ خطاب سمجھا جائے گا۔

خود قرآن مجید میں بھی تلاش کرنے سے اس کی سیکڑوں مثالیں مل سکتی ہیں۔ ان میں سے چند یہاں بھی ملاحظہ ہوں :۔

(۱) ما علی الرسول الا البلاغ المبین (سورۂ نور ع ۷) — رسول کے ذمہ سوائے صاف صاف اور کھلی کھلی تبلیغ کے اور کچھ نہیں۔

ظاہر ہے کہ اگر اس حصر کو منطقیوں کا سا اصطلاحی حصر کلی مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ رسول کے ذمہ سوائے تبلیغ کے اور کوئی کام نہیں ہے۔ حالانکہ ان کے ذمہ نماز روزہ حج قربانی وغیرہ ساری ہی دوسرے فرائض بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے سب کے نزدیک اس میں حصر اضافی ہی ہے اور مطلب یہ ہے کہ کسی کو مومن وصالح بنا دینا رسول کے ذمہ نہیں، بلکہ بس پیغام ہدایت پہونچا دینا ان کا کام ہے" (واضح رہے کہ اس مضمون کی قریباً دس بارہ آیتیں قرآن مجید میں ہیں)

(۲) انما یوحی الیّ انما الٰھکم الٰہ واحد۔ (سورۂ انبیاء ع آخر) — میری طرف تو بس یہی وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود، بس ایک ہی معبود برحق ہے۔

اس آیت میں بھی اگر منطقی قسم کا حصر کلی مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ حکم توحید کے سوا اور کسی امر کی بھی وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نہیں ہوتی تھی، حالانکہ یہ غلط ہے، اور ایسا غلط کہ اس پر عقیدہ رکھنا کفر۔ اس لئے یہ حصر بھی سب کے نزدیک اضافی اور عرفی ہی ہے، یعنی الٰہیات کے بارہ میں مشرکین کے جو مزعومات تھے بس ان کی ہی نفی مقصود ہے۔ (یہ مضمون بھی قریب قریب انہی الفاظ میں قرآن پاک میں بہت سی جگہ ادا کیا گیا ہے)۔

(۳) قل لا اجد فیما اوحی الیّ محرما علی طاعم یطعمه الا ان یکون میتة او دما مسفوحا او لحم خنزیر فانه رجس او فسقا اھل لغیر اللہ به (انعام ع ۱۸) — اے رسول! آپ کہدیجئے کہ میرے پاس جو وحی بھیجی گئی ہے میں اس میں کوئی حرام غذا نہیں پاتا کسی کھانے والے کے لیے سوائے اس کے کہ وہ مردار جانور ہو یا بہتا ہوا خون ہو، یا خنزیر کا گوشت ہو کیونکہ وہ بالکل ناپاک ہے۔ یا وہ جانور جو خدا کی نافرمانی میں غیر اللہ کے لئے نامزد کیا گیا ہو۔

اس آیت میں بھی اگر حصر کلی مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ شریعت اسلامیہ میں بجز ان چار چیزوں کے اور سب چیزوں کا کھانا جائز ہے۔ گویا بلی، کتے سارے درندے، پرندے، حشرات الارض وغیرہ وغیرہ میں سے کسی کا کھانا بھی حرام نہیں۔ حالانکہ یہ بالبداہت باطل ہے اور سب کے نزدیک یہاں بھی حصر اضافی ہی ہے، اور صرف انہی چیزوں کی حرمت کی نفی مقصود ہے جن کو مشرکین عرب نے اپنی توہم پرستی سے حرام مان رکھا تھا، (یہ مضمون بھی قرآن پاک میں متعدد جگہ وارد ہوا ہے)۔

(۴) اولم یتفکروا ما بصاحبھم من جنۃ ان ھو الا نذیر مبین (اعراف ع ۲۳)

کیا ان لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ ان کے پاس بھیجے ہوئے رسول کو ذرا بھی جنون نہیں وہ تو سوا اس کے کچھ نہیں کھاف صاف ڈرانے والے ہیں۔

اس آیت کے آخری جزو میں بھی اگر حصر کلی مراد لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ رسول صرف نذیر (ڈرانے والے) ہیں اور اس ڈرانے کے سوا ان کا کوئی کام اور کوئی وصف نہیں ہے حالانکہ قرآن ہی ان کے اور بہت سے کام اور بہت سے اوصاف بیان کرتا ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ "بشیر" ہیں، شاہد ہیں، خاتم النبیین ہیں، رحمۃ للعلمین ہیں، مزمل ہیں مدثر ہیں۔ مومنین کے ساتھ رؤف ہیں رحیم ہیں وغیرہ وغیرہ۔ پس یہاں بھی حصر اضافی ہی ہے، یعنی کفار و مشرکین کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو غلط فہمیاں تھیں اور حضور پر جو بہتان وہ لگاتے تھے۔ بس ان کی نفی مقصود ہے نہ کہ "انذار" کے علاوہ تمام دوسری واقعی صفات کی (یہ مضمون بھی قرآن پاک میں قریباً ایسے ہی لفظوں میں دسیوں بیسیوں جگہ مذکور ہوا ہے۔

"مشتے نمونہ از خروارے" صرف انہی چند آیتوں کی طرف یہاں اشارہ کر دینے پر اکتفا کیا جاتا ہے ورنہ حصر اضافی وعرفی کی اور بھی ایسی صدہا مثالیں محض قرآن کریم ہی سے پیش کی جا سکتی ہیں

حصر کی مخصوص تعبیرات کے علاوہ "خالص نفی" کی بھی ایسی بہت سی مثالیں قرآن پاک میں مل سکتی ہیں کہ بظاہر ایک چیز کی مطلقاً نفی کی جا رہی ہے لیکن مقصود اس کے کسی خاص پہلو اور کسی خاص نوع کی نفی کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن پاک میں متعدد جگہ قیامت کے دن کے متعلق فرمایا

گیا ہے :-

لا بیع فیہ ولا خلۃ ولا شفاعۃ (نہ اُس دن میں کوئی خرید فروخت ہوگی، نہ کوئی دوستی ہوگی اور نہ کوئی شفاعت :

حالانکہ ایمانی دوستی اور للٰہی محبت کا قیامت کے دن کارآمد ہونا اور علیٰ ہذا باذن خداوندی اہل ایمان کیلئے شفاعت کا ہونا خود قرآن مجید سے ثابت اور مسلمات دین میں ہے اسلئے سب کے نزدیک ان آیات میں اسی دوستی اور اسی شفاعت کی نفی کی گئی ہے جو اللہ پاک کے مقررہ قانون اور اس کی مرضی کے خلاف ہو۔

پس انہی آیات کی طرح " لیس للانسان الا ما سعیٰ " اور اُس جیسی دوسری آیات کے متعلق بھی سمجھنا چاہیئے کہ ان میں حصر اور نفی کلی نہیں ہے اور ان کا مطلب اور مفاد یہ نہیں ہے کہ " انسان کی اپنی سعی و محنت کے علاوہ کوئی دوسری چیز مطلقاً اس کے کام ہی نہیں آسکتی " عرض کیا جا چکا اور بہ دلائل ثابت کیا جا چکا کہ یہ مطلب خود نصوص قرآنی کے خلاف ہے (اللہ کی رحمت کا کام آنا، شافعین کی شفاعت کا نافع ہونا، پس ماندگان کے دعا و استغفار سے مردوں کو فائدہ پہونچنا خود قرآن سے ثابت کیا جا چکا ہے) لہٰذا ماننا پڑیگا کہ یہ حصر کلی نہیں ہے بلکہ آیات مندرجہ بالا کی طرح یہاں بھی حصر اضافی اور عرفی ہی ہے اور مطلب بس یہ ہے کہ اپنے نسبی بزرگوں یا پیروں پیشواؤں کی نیک عمل کے فائدہ مند اور ذریعہ نجات ہونے کے بارے میں مختلف قوموں اور گروہوں کے جو گمراہانہ خیالات اور بے بنیاد جھوٹی امیدیں ہیں وہ سب غلط ہیں، ایک کی کمائی دوسرے کے کام نہیں آئے گی بلکہ اپنی ہی سعی و محنت ہر ایک کے کام آئے گی " ۔

الغرض مذکورہ بالا وجوہ سے ماننا پڑیگا کہ (اگر "ل" اس آیت میں انتفاع کے لئے ہے تو) اس سے صرف ان غلط توہمات کی تردید مقصود ہے جن میں لوگ مبتلا تھے ۔۔۔ اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں بھی اس آیت کا " مسئلہ ایصال ثواب " سے نفیاً یا اثباتاً کوئی تعلق نہیں رہتا ۔

یہاں تک جو کچھ بحث کی گئی ہے اگرچہ اس کا تعلق سورۂ والنجم کی آیت لیس للانسان الا ما سعیٰ " سے ہی تھا لیکن اسی سے اُن تمام دیگر آیات کا مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے جو منکرین ایصال ثواب کی طرف سے اس کے علاوہ پیش کیجاتی ہیں ۔

مثلاً لها ما کسبت وعلیها ما اکتسبت "ہر نفس کے لئے وہی ہے جو اس نے کمایا ہے اور اس پر انہی گناہوں کا وبال ہے جو اس نے کئے ہیں"

الیوم تجزیٰ کل نفس ما کسبت وہم لا یظلمون { بروز قیامت ہر نفس کو اس کے کئے کا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔

ھل تجزون الا ما کنتم تعملون — تم کو صرف تمہارے اعمال ہی کا بدلہ دیا جائے گا

من عمل صالحا فلنفسہ ومن اساء فعلیہا { جو کوئی نیک عمل کریگا تو وہ اپنے لئے کریگا اور جو برائی کریگا تو اسی پر اس کا وبال ہوگا۔

تو یہ اور ان جیسی اور بھی جو آیات ہیں ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے اس قانون عدل کا اظہار مقصود ہے کہ آدمی اپنے ہی اعمال کے ثواب عذاب کا حقدار اور ذمہ دار ہے کسی کے نسبی رشتہ یا روحانی تعلق کی بنیاد پر دوسرں کی نیک عملی سے وہ اپنی نجات کی امید میں نہ بیٹھا رہے اور نہ یہ امید رکھے کہ میرے گناہوں کی سزا کسی اور پر ڈال دی جائے گی، علیٰ ہذا یہ بھی نہ سمجھے کہ بے گناہ کئے یا گناہ کے حساب سے زیادہ کسی کو سزا دی جائیگی"۔

بہرحال ان آیات میں بھی جہاں جہاں حصر کیا گیا ہے وہ بھی حصر اضافی اور عرفی ہی ہے اور ان کا کوئی تعلق نفیاً یا اثباتاً مسئلہ زیر بحث سے نہیں ہے۔ علیٰ ہذا سورۂ "طور" کی آیت "کل امرءٍ بما کسب رھین" اور سورہ مدثر کی آیت کل نفس بما کسبت رھینۃ" کا مقصد بھی اللہ پاک کے اسی قانونِ عدل کو واضح کر کے سلسلہ جزا و سزا کے متعلق ان ہی گمراہانہ خیالات کی تردید کرنا ہے جن میں لوگ عام طور سے مبتلا تھے؛ بہرحال ان آیات سے بھی یہ نتیجہ نکالنا "کہ آدمی کو اپنے کسب و عمل اور اپنی ذاتی سعی و محنت کے سوا کسی اور چیز سے مطلقاً فائدہ نہیں پہنچ سکتا"۔ اپنی ہی خوش فہمی ہے، اور اس سلب کلی کے خلاف خود نصوص قرآن اور دیگر ادلۂ شرعیہ ناطق ہیں۔

اس موقع پر شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رہ کی ایک عبارت کا نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس عبارت کو "بذل المجہود شرح سنن ابی داؤد" میں " باب ما جاء فی الصدقۃ عن المیت" کے ذیل میں نقل کیا ہے۔

من اعتقد ان الانسان لا ینتفع الا بعملہ فقد خرق — جس کا یہ عقیدہ ہو کہ انسان کو اپنے ذاتی عمل کے سوا اور کسی چیز سے کوئی نفع نہیں ہوگا وہ امت کے اجماع کے مخالف ہے

الاجماع فان الامة قد اجمعوا
على ان الانسان ينتفع بدعاء
غيره وهو انتفاع بعمل الغير
وايضا انه عليه الصلوة والسلام
يشفع لاهل الموقف فى الحساب
ثم لاهل الجنة فى دخولها ثم
لاهل الكبائر فى الاخراج من النار
وهو انتفاع بسعى الغير وكذا كل
نبى وصالح له شفاعة وذالك
انتفاع بعمل الغير وايضا الملئكة
يدعون ويستغفرون لمن فى
الارض وذالك منفعة بعمل الغير
وايضا انه تعالى يخرج طائفة
من النار ممن لم يعمل خيرا قط
بمحض رحمته وهذا انتفاع من
غير سعيهم وايضا اولاد المومنين
يدخلون الجنة بعمل اٰبائهم و
ذالك انتفاع بمحض عمل الغير
وكذالك الميت ينتفع بالصدقة
عنه وبالعتق عنه بنص السنة
والاجماع وهو من عمل غيره
وانه يسقط الحج المفروض عن
الميت بحج وليه عنه بنص السنة

کیونکہ ساری امت کا ان چند اصولوں پر اتفاق ہے۔
انسان کو دوسروں کی دعا سے فائدہ ہوتا ہے اور ظاہر
ہے کہ یہ غیر ہی کے عمل سے انتفاع کی صورت ہے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حساب چکانے کے لئے
تمام اہل محشر کی سفارش فرمائیں گے۔ نیز مستحقین جنت کے
حق میں داخلہ جنت کی اور بہت سے بڑے گناہگاروں
کے لئے دوزخ سے نکالے جانے کی بھی شفاعت فرمائینگے
اور ظاہر ہے کہ لوگوں کا آنحضرتؐ کی اس شفاعت سے بہرہ
اندوز ہونا دوسرے ہی کی سعی سے نفع کی صورت ہے علیٰ ہذا
مختلف لوگوں کے لئے دیگر انبیاء و صالحین کا شفاعت کرنا بھی
ایک مسلمہ مسئلہ ہے۔ اسی طرح اہل دنیا کے مسلمانوں کے لئے
ملائکہ کا دعا و استغفار کرنا اور اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچنا (جو
ثابت شدہ امر ہے) انتفاع بعمل الغیر ہی کی ایک جزئی ہے۔
نیز (احادیث کثیرہ کی بنیاد پر) یہ بھی مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ محض
اپنی رحمت سے کچھ ایسے لوگوں کو بھی دوزخ سے نکالے گا جن کے
پاس (بجز ادنیٰ درجہ ایمان کے) کوئی نیک عمل نہ ہوگا اور بلاشبہ
یہ بھی اپنی ذاتی سعی و عمل کے سوا ہی انتفاع کی صورت ہے ایسے
ہی یہ بھی مسلمات میں سے ہے کہ اہل ایمان کے بچے بھی اپنے والدین کے
نیک اعمال کی وجہ سے ان کے ساتھ جنت میں جائینگے۔ اور یہ
بھی غیر ہی کے عمل سے انتفاع ہوا۔ اسی طرح اگر میت کی طرف سے
صدقہ خیرات کیا جائے یا غلام آزاد کیا جائے تو اس کا نافع ہونا بھی
سنت صریحہ ثابتہ اور اجماع سے ثابت ہے۔ نیز میت کی طرف سے
اگر اسکا ولی حج کرے تو میت کی جانب سے حج کا ادا ہو جانا بھی سنت

"وكذا تبرء ذمة الانسان من ديون الخلق اذا قضاها عنه قاض وذالك انتفاع بعمل الغير وكذالك الصلوة والدعاء له فيها ينتفع بها الميت وهي من عمل الغير ونظائر ذالك كثيرة لا تحصى"

صریحہ سے معلوم ہوا ہے۔ یا ایسے ہی کسی آدمی پر قرض ہو اور اس کی طرف سے کوئی دوسرا ادا کر دے تو مدیون کی طرف سے ادا ہو جانا اور اس کا بری ہو جانا بھی شریعت اسلامیہ میں ایک ثابت شدہ مسئلہ اور امت کا مسلمہ ہے اور یہ بھی دوسروں ہی کے سعی و عمل سے انتفاع ہوا۔ پھر اس سب کے علاوہ مُردوں پر نماز جنازہ پڑھنا اور اس میں ان کیلئے مغفرت و رحمت کی دعا کرنا، اور ان کے حق میں اس کا نافع ہونا ایک مسلمہ امر ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ بھی دوسروں ہی کے عمل سے انتفاع کی صورت ہے — اور انکے علاوہ بھی اسکی بہت سی نظیریں ہیں جن کو شمار بھی نہیں کیا جا سکتا۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کی اس عبارت سے ناظرین کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ منکرین ایصال ثواب کا یہ ادعا کہ "انسان کو اپنے ذاتی سعی و عمل کے سوا کسی اور چیز سے مطلقاً کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا" دین کے کتنے مسلّمہ مسائل کے خلاف ہے جن میں سے بعض نصوص قرآن سے اور بعض سنّت و اجماع سے ثابت ہیں۔ پھر اپنی اس خوش فہمی کو قرآن مجید کے سر منڈھنا، ان کی کتنی خطرناک جسارت ہے۔

درحقیقت جن آیات کی طرف وہ اس مضمون کو منسوب کرتے ہیں ان کا صحیح مطلب اور مفاد وہی ہے، جو اوپر عرض کیا گیا جس کے بعد ادلّہ شرعیہ میں کوئی تضاد اور تدافع نہیں رہتا۔

واضح رہے کہ یہ آیات جن سے منکرین ایصال ثواب استناد کرتے ہیں، ان کے متعلق جو کچھ اوپر عرض کیا گیا، اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ (بلکہ ان میں سے بعض کا تعلق تو بشہادت سیاق و سباق صرف عذاب و سزا ہی کے پہلو سے ہے) لیکن بخوفِ طوالت یہاں ہم نے اس قسم کی تمام تفصیلات سے صرف نظر کر کے اتنی ہی جوابی بحث کو کافی سمجھا ہے۔

ایک عقلی مغالطہ

آخر میں منکرین کے ایک عقلی مغالطہ کا ذکر کر کے اور اس کا جواب دے کے اس بحث کو ہم ختم کرتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ خود کوئی نیک عمل کر کے اس کا ثواب دوسرے کو پہنچانا ایسا ہی ناقابلِ فہم اور غیر معقول ہے جیسا کہ خود کھانا کھا کے اللہ سے یہ عرض کرنا کہ جو کھانا میں نے کھایا ہے اس سے فلاں

بھوکے کا پیٹ بھر جائے۔ یا سردی کے موسم میں خود گرم کپڑے اوڑھ کے یہ کہنا کہ ان کپڑوں کی گرمی فلاں ننگے شخص تک پہنچ جائے۔"

لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ نہایت ہی عامیانہ سفسطہ ہے۔ اگر اس مادی عالم میں اس کی مثال ہی تلاش کرنی ہے تو سیدھی مثال یہ ہے کہ ایک شخص صبح سے شام تک خود محنت کرتا ہے اور جو مزدوری اس کو حاصل ہوتی ہے وہ بجائے اپنے اوپر ہی خرچ کرنے کے کسی اور کو دیدیتا ہے۔ یا اپنی آمدنی سے کسی دوسرے بیچارہ کا قرضہ ادا کر دیتا ہے۔ یا خود محنت کر کے کھانا تیار کرتا ہے اور کسی دوسرے صاحبِ حاجت کو کھلا دیتا ہے، فرمائیے اس میں کیا عقلی اشکال ہے؟۔ بلکہ احادیث میں اسی قسم کی مثالوں سے اس مسئلہ کو سمجھایا گیا ہے۔

اور اگر ان حضرات کو اس پر اصرار ہو کہ نہیں، نیک اعمال اور جزائے اُخروی کی مثال بس کھانا کھانے اور اس سے لذت اندوز ہونے اور شکم سیر ہو جانے کی سی ہی ہے تو پھر مسئلہ ایصالِ ثواب کے علاوہ میت کے لئے مغفرت و رحمت کی دعا کا بھی ان حضرات کو انکار کرنا پڑیگا۔ بلکہ اس کو بھی غیر معقول اور غلط ماننا ہوگا، کیونکہ اس نظریہ کی بنیاد پر کسی میت کے لئے دعاءِ مغفرت اور استدعاءِ رحمت کی مثال یہ ہوگی کہ کسی بھوکے کو کھانا تو دیا نہ جائے اور خدا سے بس یہ دعا کی جائے کہ بغیر کھانے کے تو اس کا پیٹ بھر دے، اور جاڑے کے زور سے کپکپاتے ہوئے کسی غریب آدمی کے لئے خدا سے عرض کیا جائے کہ بغیر کپڑے کے تو سردی سے اس کی حفاظت فرما۔ اور گرمائی پہنچا دے ـــ پس ظاہر ہے کہ جس طرح خود کھانا کھا کر اور خود گرم کپڑے پہن کر اللہ سے یہ عرض کرنا غیر معقول ہے کہ اس کھانے اور کپڑے کا اثر فلاں بھوکے یا ننگے کو پہنچ جاوے، اسی طرح اس اصول پر یہ بھی غیر معقول ہے کہ اللہ سے یہ التجا کی جائے کہ فلاں بھوکے اور ننگے کا بغیر کھانے کے پیٹ بھر جائے اور بغیر کپڑوں کے وہ سردی کی تکلیف سے بچ جائے کیونکہ آپ حضرات کے نزدیک اس تمثیل میں "عمل" کا مقام وہی ہے جو اس مادّی عالم میں کھانے کپڑے کا ہے اور آخرت کا ثواب آپ حضرات کے نزدیک لذتِ طعام، شکم سیری، اور کپڑوں سے حاصل ہونے والی راحت کی طرح ہے۔

یہ جواب تو ان ہی حضرات کے اصول اور انہی کے طرز پر دیا گیا ہے۔ لیکن اصل بات یہی ہے کہ ان تفصیلات میں عالمِ آخرت کو اس مادّی عالم پر قیاس کرنا اور اس کو شرعی فیصلوں کی

بنیاد بنانا سرے ہی سے غلط اصول ہے۔ ہاں شرعی دلائل سے کسی مسئلہ کا فیصلہ ہو جانے کے بعد اگر اس قسم کے قیاسی لطائف سے بھی اس کی مزید تائید دکھائی جائے تو مضائقہ نہیں۔ اور ہم عرض کر چکے کہ اس مادی عالم میں ایک شخص کا اپنی محنت اور اپنی کمائی سے دوسروں کی مدد کرنا "ایصالِ ثواب" کی واضح نظیر ہے ۔۔۔ بلکہ اب تو آنکھیں یہ بھی دیکھ رہی ہیں کہ ایک شخص اپنی پیدا کردہ دولت سے اچھی غذائیں کھاتا ہے اُس سے عمدہ خون پیدا ہوتا ہے پھر اس کی کسی بیمار اور ضعیف محسن یا دوست یا عزیز کو ڈاکٹر کا مشورہ ہوتا ہے کہ کسی طاقتور آدمی کا خون تمہارے جسم میں داخل کئے جانے کی ضرورت ہے۔ یہ تندرست شخص اپنے کو پیش کر دیتا ہے اور ڈاکٹر اس کی کسی رگ میں سے بہترین خون لے کر اس کے اس بیمار محسن یا دوست یا عزیز کی رگوں میں پہنچا دیتا ہے اور اس سے اس میں توانائی آجاتی ہے تو اگر ایصالِ ثواب کے لئے اس مادی عالم ہی میں مثال تلاش کرنی ہے تو یہ بھی اس کی ایک اچھی مثال ہو سکتی ہے۔ لیکن واضح رہے کہ بس سمجھنے کے لئے یہ ایک مثال ہی ہوگی، نہ کہ مسئلہ کی دلیل اور بنیاد۔

زندوں کی جانب سے اموات کی نفع رسانی اور "ایصالِ ثواب" کے متعلق اس مقالہ میں جو کچھ لکھنے کا ارادہ کیا تھا وہ سب بحمد اللہ لکھا جا چکا۔ شروع میں بھی عرض کیا گیا تھا اور اب آخر میں بھی اس کا اعادہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس کاوش کا مقصد صرف اصولی مسئلہ ایصالِ ثواب کی حمایت ہے جو جمہورِ امت کا ہمیشہ سے ایک متفقہ نظریہ رہا ہے اور دلائل شرعیہ سے جس کے ثبوت میں ہمارے نزدیک کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔

لیکن اس ایصالِ ثواب کی بنیاد پر تیجہ۔ دسواں۔ بیسواں۔ چالیسواں۔ ششماہی۔ گیارھویں، بارھویں۔ برسی۔ عرس۔ جمعراتی فاتحہ وغیرہ وغیرہ رسوم کی شکل میں جو ایک مستقل "شریعت" اہلِ ہوی وہوس نے دوسری قوموں کی دیکھا دیکھی تراش لی ہے ان کے غلط بلکہ بدعت ومعصیت ہونے میں کوئی شبہ نہیں ان خرافات کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔

علیٰ ہذا یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دین سے ایصالِ ثواب کی ہرگز ہرگز وہ اہمیت ثابت نہیں جو اس کو آج کل نہیں بلکہ صدیوں سے مسلمانوں نے دے رکھی ہے۔ ہمیشہ کے لئے ہر چیز کا وہی مقام رہنا چاہئے جس میں عہدِ نبویؐ اور دورِ صحابہؓ میں اس کو رکھا گیا تھا، اب کیفیت یہ ہے کہ

"ایصالِ ثواب" مسلمانوں کا قریباً آدھا دین بن کے رہ گیا ہے، دین کے سیکڑوں مہمات سے انہیں وہ دلچسپی نہیں، جو بزرگوں اور عزیزوں قریبوں کے ایصالِ ثواب سے ہے، عوام کے علاوہ بہت سے وہ بھی جو خواص سمجھے جاتے ہیں، اس بیماری میں مبتلا ہیں، بلکہ میرا تو خیال ہے کہ ایصالِ ثواب کے اصول ہی سے انکار کا جو رجحان زمانہ حال کے بہت سے نئے طرز کے پڑھے لکھے مسلمانوں میں پیدا ہو رہا ہے وہ "ایصالِ ثواب" میں اس افراط اور غلو ہی کا ردِّ عمل ہے — اس لئے زیادہ توجہ کے قابل اور زیادہ اصلاح کا محتاج "ایصالِ ثواب" میں غلو کرنے والوں ہی کا طرزِ عمل ہے، کہ انہی کا افراط اس تفریط کی پیدائش کا سبب بن رہا ہے۔

اللھم اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضآلین ۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

شعبان ۱۳۶۳ھ